نئی لائبریری

طلسمِ خیال

افسانے

کرشن چندر

نیا ادارہ

6.00

افسانے

کرشن چندر

طلسمِ خیال

نیا ادارہ

۱۵- سرکلر روڈ، لاہور

جملہ حقوق محفوظ

طابع و ناشر : نذیر احمد چودھری
نیا ادارہ — حمایت اسلام پریس ، — لاہور

فہرس

دیباچہ ، ۷

جہلم میں ناؤ پر ، ۲۳

اندھا چھترپتی ، ۳۵

مجھے کتے نے کاٹا ، ۵۱

تالاب کی حسینہ ، ۶۵

آنگی ، ۷۳

صرف ایک آنہ ، ۸۷

لاہور سے بہرام گلہ تک ، ۹۹

مامتا ، ۱۲۳

قبر ، ۱۲۹

گوماں ، ۱۴۳

مصور کی محبت ، ۱۵۷

یرقان ، ۱۷۳

دیباچہ

پروفیسر سید فیاض محمود ایم۔ اے

کہانیاں کہنے اور سننے کا شوق انسان کے دل میں ہزارہا سال سے موجود ہے۔ اوّل اوّل تو یہ کہانیاں شاید سچے واقعات پر مبنی ہوں گی۔ مگر انہیں بیان کرتے وقت راوی ضرور کہیں نہ کہیں کہانی کے کسی نہ کسی پہلو کو اپنی مرضی کے مطابق یا کوئی خاص اثر پیدا کرنے کی غرض سے بڑھا چڑھا کے بیان کر دیتا ہوگا۔ اگر یہ واقعہ کسی سردار کی مدح میں ہوتا تو شاید واقعات کو جلا کر اور ان میں اضافہ کر کے اپنے ممدوح کو خوش کرنے کے لیے وہ مبالغہ اور اپنی قوت اختراع سے بھی کام لیتا ہوگا۔ بعد میں فرضی بہادر دل عاشقوں اور شکاریوں کے قصے بھی لوگوں نے تراشنے شروع کر دیے ہوں گے۔ ایسی کہانیاں ہر قوم کے پرانے ادبیات میں پائی جاتی ہیں۔ عام طور پر ایسے قصے ان کی مذہبی کتابوں میں ملتے ہیں۔ ان کہانیوں کا مقصد انسانی زندگی کے کسی پہلو پر اخلاقی روشنی ڈالنا ہوتا ہے۔

مگر ان قدیم کہانیوں میں جس چیز پر زور دیا جاتا ہے وہ ان کے افراد کی غیر معمولی قوتیں ہیں۔ کہیں کسی شخص کے صبر کی تعریف ہوتی ہے تو کہیں اس کی بہادری کی۔ کہیں اس کی

نیکی کی اور کہیں اس کی حیرت انگیز مستقل مزاجی کی۔ عام طور پر ان افراد کو کسی نہ کسی صورت میں غیبی مدد ملتی رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے خارق العادت انسان اور غیر معمولی واقعات سے فقط ہمیں عالمِ غیب اور خدائے قدوس کی جبروت اور اس کے انسان پر جو احسانات ہیں، ان کے سوا اور کچھ معلوم نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ ان سے لوگ اچھے سبق بھی حاصل کر سکتے ہیں اور سنا ہے کہ عبرت بھی پکڑ لیتے ہیں۔

ایسی کہانیاں کسی خاص اصول کے ماتحت وضع نہیں کی جاتی تھیں۔ عام طور پر ان میں مختصراً کسی آدمی یا عورت کی ساری زندگی کے حالات ہی بیان کر دیے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ لوگ محسوس کرتے گئے کہ اس اختصار سے کسی شخص کی زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات کا تو ذکر ہو گیا مگر ان سے اس شخص کی ذہنی حالت، دلی کیفیت اور معاشرتی زندگی کے حال سے کچھ زیادہ آگاہی نہیں ہوئی۔ اس لیے لمبی لمبی داستانیں، رومانیں اور بعد میں ناول لکھے جانے لگے۔ جن میں آدمی کی پیدائش سے اس کی شادی تک، یا پھر موت تک کے حالات بیان کیے جاتے ــــ جیسے جیسے لوگ زیادہ خود شناس ہوتے گئے، ویسے ویسے وہ ناول لکھنے کے اصول بھی وضع کرتے گئے۔ چنانچہ مصنفین اپنے ناول ان اصولوں پر پورے اتارنے کی کوشش میں کافی ذہنی کاوش خرچ کرنے لگے۔ آہستہ آہستہ ان ضوابط میں بھی تبدیلی ہوتی گئی اور پھر نئے مقتدر ناولسٹ نے اپنی خاص طرز نکال لی۔ کوئی زندگی کے کسی ایک پہلو پر زور دیتا تو دوسرا کسی اور نگاہ سے لکھتا۔ بعض تو محض اپنی کہانی کی ساخت یعنی پلاٹ پر زور دیتے اور بعض کردار نگاری پر بعض ماحول اور طریقۂ بود و ماند پر تو بعض معاشرت اور کسی خاص تمدن کی تصویر کشی پر۔ بعض کسی زمانہ کا نقشہ کھینچتے تو بعض کسی قوم یا ملک کی ذہنیت کا تجزیہ کرتے اور آج کل کے زمانہ میں تو مغرب میں ایسے ناول بھی لکھے جانے لگے ہیں جو محض خیالات کے ایک لا متناہی سلسلہ کی عکاسی کرتے ہیں اور انسان کے شعوری اور لاشعوری جذبات کی تحلیل کو اپنا مطمحِ نظر بناتے ہیں۔ غرض وہاں ناولوں کی بھی کئی ایک قسمیں ہیں اور اس

فن کے ہزار ہا نکات۔

افسانہ نگاری جس سے ہم سب کی مراد مختصر افسانہ لکھنے سے ہے۔ بحیثیت ایک علیحدہ صنفِ ادب کے انیسویں صدی کی اختراع ہے۔ اس سے پہلے مصنف کہانیاں لکھتے تھے۔ مگر ان میں اور قدیم زمانہ کی کہانیوں میں بہت کم فرق ہوتا تھا۔ فنی لحاظ سے جسے ہم اب افسانہ کہتے ہیں ایک علیحدہ چیز ہے۔ اس میں اور ناول میں بہت بڑا فرق ہے۔ ظاہر میں تو ضخامت کا فرق ہی ان دونوں کو ایک دوسرے سے ممیز کرتا ہے مگر در اصل ان میں ایک ایسا بنیادی فرق ہے جس کا ضخامت سے کوئی تعلق نہیں۔ مشہور عالم روسی افسانہ نگار چیخوف کے کئی ایک افسانے سو سو صفحوں سے زیادہ طویل ہیں۔ مگر انہیں کسی صورت میں ناول نہیں کہا جا سکتا۔ ناول میں کسی ایک شخص یا تین یا دس یا پچاس اشخاص کی زندگی، ان کے ایک دوسرے سے تعلقات، میل جول، خیالات اور واقعات کا حال مفصل طریقہ سے لکھا جا سکتا ہے۔ ایک کنبہ چھوڑ ایک قبیلہ اور ایک قبیلہ سے قطع نظر ایک ملک کا حال چند مفروضہ اور نمایاں شخصیتوں کے تجربات زندگی کے ذریعہ سے ایک ناول میں بیان ہوتا ہے مگر افسانہ میں کسی ایک حادثہ، ایک واقعہ ایک پہلو، اور ایک جھلک کی تصویر سے زیادہ مضمون کی گنجائش نہیں کیونکہ اس میں سب سے مقدم چیز وحدت اثر ہے۔ کوئی واقعہ، کوئی بات، کوئی لفظ، کوئی ایسا اشارہ اس میں موجود نہیں ہو سکتا جو لاتعلق اور بے ضرورت ہو یا جس سے افسانہ کی یکرنگی میں فرق پڑ جائے، یا جس سے قاری کی توجہ مرکزی واقعہ یا کردار یا نکتہ سے ہٹ جائے، چنانچہ ساخت کے لحاظ سے وہ افسانہ کامیاب ہوگا جس میں کوئی غیر متعلق شے موجود نہ ہو۔ اگر افسانہ عملی ہے یعنی کسی خارجی واقعہ سے تعلق رکھتا ہے تو اس میں کوئی شاخ کوئی شوشہ ایسا نہیں نکلنا چاہیئے جس کا افسانوی عمل سے بلا واسطہ رشتہ نہ ہو اور اگر افسانہ کرداری ہے تو اس میں اس کردار یا ان کرداروں کے سوا جس کا اس افسانہ سے بدنی تعلق ہے کوئی بے ضرورت فرد نہیں شامل ہونا چاہیئے۔ جتنے افراد افسانہ میں داخل کیے گئے ہیں انہیں فقط ایسی باتیں کرنی چاہئیں جن کا

اس افسانہ سے بلا واسطہ تعلق ہو۔ دیگر حشو و زوائد سے افسانہ کو بالکل پاک ہونا چاہیے، حتیٰ کہ اس کی زبان بھی ایسی دُھلی ہوئی اور صاف ہونی چاہیئے جو بذاتہ جاذب توجہ ہو۔ الفاظ کا انتخاب ایسا ہونا چاہیے جس سے کم از کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ اثر پیدا ہو سکے۔

شاید کوئی صاحب یہ سوال کر بیٹھیں کہ فنی لحاظ سے کس قسم کا افسانہ بہترین ہوتا ہے ؟ ——— المیہ، طربیہ، مزاحیہ، رومانی، معاشرتی، تاریخی یا اخلاقی ؟ اس کا جواب میں یہ دوں گا کہ افسانہ وہ کامیاب ہے جس کی سچائی ایک آدمی یا ایک قوم یا ایک مذہب تک محدود نہ ہو بلکہ جو فطرت انسانی کی صحیح ترین ترجمانی کرے مگر افسانہ کی نوعیت افسانہ نگار کی ذہنیت سے تعلق رکھتی ہے۔ زندگی میں غم، خوشی، مزاح، رومانیت، پھیکا پن سب کچھ موجود ہے۔ یہ افسانہ نگار کی دماغی اور نفسیاتی ساخت پر منحصر ہے کہ وہ زندگی کی بے پایاں وسعتوں سے کن واقعات کا انتخاب کرے۔ عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ جس طرف مصنف کا رجحان ہو۔ اسے دنیا کا ہر واقعہ اسی رنگ میں رنگا ہوا نظر آتا ہے۔ بعض لوگ دنیا میں فقط رنج و الم ہی دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہر محبت ناکام اور عاشق نامراد ہوتا ہے۔ بعض اپنی طبیعت سے مجبور ہو کر مایوسی و قنوطیت سے شدید نفرت کرتے ہیں اور ان کی نظر میں ایسے مصنّف زندگی کا ایک رخ ہی پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک منظر کو لیجیے :۔

ایک تنگ و تاریک گلی ہے۔ جس کے دونوں طرف کم حیثیت مکانوں کی قطاریں چلی جاتی ہیں۔ گلی کے درمیان ایک نالی ہے۔ گلی کچی ہونے کے باعث عام طور پر کیچڑ سے بھری رہتی ہے۔ اس پر بھی چھوٹے لڑکے لڑکیاں گھروں کے باہر ادھر اُدھر کھیلنے میں یا چیخنے چلانے میں مصروف رہتے ہیں۔ لوگوں کی آمد و رفت بھی ہے۔ کھڑکیوں میں سے مرد یا عورت یا جوان لڑکے لڑکیاں نیچے یا سامنے جھانک بھی لیتے ہیں۔ لوگ فارغ البال نہیں۔ اب دیکھیے ایک رومانی افسانہ نگار ایسے منظر میں کیا دیکھتا ہے۔

ایک جوان لڑکی کھڑکی میں کھڑی دھوپ میں اپنے بال سکھا رہی ہے۔ کبھی کپڑے سے

انہیں پونچھ لیتی ہے تو کبھی ہاتھوں سے انہیں جھٹک کر کندھوں پر بکھیر لیتی ہے۔ بالوں سے ایک لمحہ اس کی توجہ ہٹتی تو وہ نیچے گلی میں کھیلتے ہوئے بچوں کو ایک اچٹتی نظر سے دیکھ لیتی ہے۔ مگر دراصل اس کی نظر ادھر ادھر سے ہٹ کر ایک سامنے کے مکان کی کھڑکی سے گزرتی ہوئی ایک چارپائی پر لیٹے ہوئے نوجوان پر پڑتی ہے جو بظاہر کتاب پڑھنے میں مشغول ہے مگر جس کی توجہ تمام تر کتاب کے صفحوں تک محدود نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

ایک فطرت نگار اسی سے مندرجہ ذیل تاثرات اخذ کرتا ہے:

"گلی کچھ زیادہ چوڑی نہیں اور اگرچہ دن کافی چڑھ آیا ہے مگر گلی میں ابھی تک تاریکی کے آثار موجود ہیں۔ لڑکے لڑکیاں جو ایک سوکھی جگہ دیکھ کر کھیلنے میں مشغول ہیں۔ زیادہ تر پتلے دبلے ہیں۔ ایک بوڑھی اور کبڑی عورت ہاتھ میں لکڑی لیے آہستہ آہستہ چلی آرہی ہے۔ اسے اس خشک جگہ سے گزرنا ہے جہاں وہ لڑکے کھیل رہے ہیں مگر وہ اس کے لیے نہیں ہٹتے وہ چھڑی سے انہیں ہٹاتی ہے مگر ہر کوئی وہ ایک ایک انچ اپنی جگہ سے سرک کے پھر وہیں آکھڑا ہوتا ہے اور باوجودیکہ وہ بڑھیا اونچی آواز میں بڑبڑاتی ہے۔ وہ اس کی بات نہیں سنتے۔ اتنے میں ایک لڑکا کسی دوسرے کو دھکا دیتا ہے اور وہ دوسرا پیچھے جو ہٹتا ہے تو بڑھیا کی چھڑی والے ہاتھ سے آکر ٹکراتا ہے، چھڑی گر جاتی ہے اور اس کے ساتھ وہ بڑھیا بھی، سب بچے بڑھیا کو گرتے دیکھ کر بھاگ جاتے ہیں۔ بڑھیا بیچاری کے چوٹ آجاتی ہے انہاں کے آنسو نکل آتے ہیں۔ بصد مشکل وہ اپنے آپ کو اٹھاتی ہے اور پھر اپنی چھڑی پکڑے آگے بڑھ جاتی ہے۔ جب وہ آگے نکل جاتی ہے تو لڑکے واپس آکر کھیلنے لگتے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی اس بڑھیا کے متعلق سوال نہیں کرتا۔ وغیرہ اور وغیرہ۔"

اسی طرح ایک معاشرتی افسانہ لکھنے والا یہ واقعات دیکھتا ہے:

"ایک گھر سے خاوند کپڑے وپڑے پہن کر باہر کام پر جانے کو ہے کہ بیوی اس کے سامنے کھانا لاکے رکھتی ہے۔ اتفاق سے کھانے میں نمک زیادہ ہوتا ہے۔ میاں اعتراض کرتا ہے۔

بیوی مزاج کی تیز ہے۔ وہ "جواب باصواب" دیتی ہے۔ خاوند دیکھتا رہتا ہے۔ بیوی کہتی ہے تمہیں تو کچھ پسند ہی نہیں آتا۔ میاں کہتا ہے تمہیں تو کسی چیز کا سلیقہ ہی نہیں، کہتی ہے تمہیں تو بولنے کی عادت ہے، میاں کہتا ہے تم اپنی طرف تو دیکھو۔ غرض یہ کہ میاں روٹی ہاتھ میں اٹھا لیتا ہے اور چنگیر پھینک دیتا ہے۔ بیوی اور بھی تلملاتی ہے۔ میاں کھانا زہر مار کر کے جلد اٹھتا ہے، پانی بھی نہیں پیا اور دروازہ زور سے بند کرتے باہر چلا جاتا ہے۔ اگر افسانہ کو اور زوردار بنانا ہو تو میاں کو آدھا کھانا کھلائیے اور راستے غصہ سے بھرا ہوا کام پر بھیج دیجئے۔ خاوند کے جانے کے بعد ماں برتن اٹھاتی ہے کہ اتنے میں اس کا چھوٹا بچہ جو اس دوران میں اس کی ٹانگوں سے چمٹا ہوا تھا۔ اس کی توجہ کسی اپنی بات کی طرف کھینچنا چاہتا ہے۔ وہ اُسے جھٹکا دے کر علیحدہ کرتی ہے وہ گر پڑتا ہے اور رونے لگتا ہے مگر وہ پروا نہیں کرتی وہ اور زیادہ چلاتا ہے مگر ماں اس پر خفا ہوتی ہے۔ وہ باز نہیں آتا۔ تنگ آ کے وہ خاوند کا غصہ اس بے قصور پر نکالتی ہے اور اسے ایک چپت رسید کرتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ایسے ہی اسی گلی میں رہنے والوں کے متعلق آپ کئی پلاٹ افسانے وضع کر سکتے ہیں۔ اور وہ سب کے سب حقیقت پر مبنی ہوں گے مگر وہ نفس مضمون میں، نقطۂ نگاہ میں اور اثر میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوں گے۔ یہ تو ایک گلی میں رہنے والے باشندوں کا حال ہے۔ آپ ایک ہی واقعہ کو لیجئے "سڑک پر ایک کیلے کا چھلکا پڑا ہے صبح کا وقت ہے۔ لڑکے لڑکیاں سکول جا رہے ہیں۔ ایک جوان لڑکی جو اپنے دھیان میں چلی جا رہی ہے، اس چھلکے پر قدم رکھتے ہی پھسل جاتی ہے اور سنبھل نہیں سکتی۔ وہ بھی اور اس کی کتابیں بھی گر پڑتی ہیں۔ اُس کے ساتھ والیوں میں دو ایک ہنس دیتی ہیں اور ایک اسے اٹھنے میں مدد دیتی ہے۔" اب اس واقعہ کو رومانی عینک لگا کر دیکھیے:

"لڑکی ایک نازک بدن دوشیزہ ہے جس کی رنگت سرخ و سفید ہے آنکھیں سرمگیں ہیں

اور عام طور پر بھی پلکوں سے چھپی ہوئی ہوتی ہیں، مگر اب شرم سے بالکل ہی بند ہوئی جاتی ہیں۔ جب وہ اپنی سہیلی کے سہارے کھڑی ہوتی ہیں اور کتابیں اکٹھی کر کے چلنے لگتی ہے تو اس کی نظر سامنے اٹھتی ہے اور اسے ایک جوان شکیل اور خوش پوش طالب علم دکھائی دیتا ہے جو اس کی طرف نہایت ہمدردی سے دیکھ رہا ہے۔ حیا سے اس کا چہرہ سُرخ ہو جاتا ہے اور وہ پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ طالب علم کھڑے کا کھڑا رہ جاتا ہے مگر لڑکی پھر مڑ کے نہیں دیکھتی۔ وہ دن طالب علم کے لئے بہت اُداس اور پریشان کن ہوتا ہے۔ دوسرے دن وہ اسی وقت وہاں سے گزرتا ہے اور دور دور نظر ڈالتا ہے خوش قسمتی سے وہ لڑکی پھر اسی وقت اپنی سہیلیوں سمیت وہاں سے گزرتی ہے کیونکہ اس کے سکول کا راستہ یہی ہے اور آج بھی اس کی نظریں اس طالب علم سے دوچار ہوتی ہیں۔ اسی طرح روز دیکھنے سے انہیں ایک دوسرے کی شکل سے اُنس ہو جاتا ہے اور پھر وہ لڑکا اپنا کام چھوڑ کر لڑکیوں کے پیچھے پیچھے انہیں گھر چھوڑنے جاتا ہے دو یا تین ہفتے کے بعد چھٹی کے بعد بھی اسی طرح وہ ان کے پیچھے پیچھے انہیں گھر چھوڑنے جاتا ہے اور ایک دن جرأت کر کے جب وہ لڑکی اپنے گھر داخل ہونے لگتی ہے تو وہ اسے سلام بھی کر دیتا ہے۔ وہ اپنا سر جھکا دیتی ہے۔ اس طرح اشاروں اشاروں میں اُن کی محبت کا آغاز ہوتا ہے۔ بعد میں آپ اُسے کوئی سا رنگ دے دیجیے۔ لڑکے اور لڑکی کو ہندو بنا کے اُن کی کچھ مدت بعد شادی کروا دیجیے یا لڑکے کو مسلمان اور لڑکی کو ہندو تصور کر کے اُن کی محبت کو ناکام رہنے دیجیے یا اور جو کچھ آپ کی مرضی میں آئے کیجیے۔

کوئی اور افسانہ نگار شاید یہ لکھے :

"لڑکی نے سنبھلنے کی بہت کوشش کی مگر گرنے سے نہ بچ سکی اور گری تو ایسی کہ اس کا ٹخنہ دوہرا ہو گیا اور پھر جو وہ اُٹھی تو اُس سے چلا نہ گیا۔ لڑکیوں کی نانی ساتھ تھی اور وہ ان سب کے بستے ایک ٹوکری میں رکھ کر سر پر اٹھائے ہوئے تھی۔ جب

اس نے دیکھا کہ لڑکی کے ٹخنے میں موچ آگئی ہے تو اس نے کہا: "بی بی تم اب سکول کیا جاؤ گی گھر واپس چلی جاؤ۔ میں تمہیں تانگہ کرا دیتی ہوں۔" لڑکی بیچاری غریب تھی، اس کے پاس تانگے کا کرایہ کہاں تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ گھر میں بھی روپے پیسے وافر نہیں۔ ماتاجی دل میں کڑھیں گی۔ اس لیے اس نے کہا: "نہیں کچھ نہیں ہوا۔ میں سکول چلتی ہوں۔ راجکماری کا سہارا لیے لیتی ہوں۔" چنانچہ وہ اپنی سہیلی کا سہارا لیے ہوئے درد کو دبائے بہت مشکل سے سکول پہنچی۔ وہاں جا کے دیکھا کہ ٹخنہ اتنے میں ہی بہت سوج گیا ہے اور درد بھی اب بہت زیادہ ہونے لگ گیا چنانچہ استانی نے اسے جبراً گھر بھیجا۔ جب اس کی ماتاجی نے اسے دیکھا تو انہیں دوہری تکلیف ہوئی۔ ایک تو تانگے کا کرایہ پھر مرہم پٹی اور تیمارداری۔ ان کی اپنی صحت اچھی نہ تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔"

اسی طرح آپ اسی ایک چھوٹے سے واقعہ کو کئی ایک صورتوں میں پیش کر سکتے ہیں۔ یہ فقط افسانہ نگار کی ذہنی کیفیت اور رجحانِ طبیعت پر منحصر ہے۔ اگر وہ آپ کو رُلانا چاہتا ہے اور اس کا دل خود رقیق ہے تو وہ درد اور رنج کے معمولی سے واقعے کو اس قدر بڑھا کے لکھے گا کہ آپ پڑھتے پڑھتے رو دیں گے۔ مگر فنی لحاظ سے یہ ایک ناقابلِ معافی نقص ہے۔ افسانے کی مختصر سی زمین پر ہمیں اسی کفایت سے کام لینا ہوتا ہے کہ کہیں مبالغے سے کام نہیں لیا جا سکتا اور اگر کوئی افسانہ نگار عقل کی پاسبانی سے تنگ آکر دل کو تنہا چھوڑ دے اور اپنے قارئین کو دل بھر کے رلائے تو یہ اس کا اپنا قصور ہے۔ اس کا افسانہ اس جیسے رقیق القلب حضرات کو پسند آجائے تو آجائے فنی اعتبار سے وہ افسانہ بہت گھٹیا ہوگا کیونکہ ادب میں درد و رنج اور الم کے جذبات سے ہم کام ضرور لے سکتے ہیں مگر اتنا ہی جتنے کی ہمیں اپنے تجربۂ حیات کے پیش کرنے میں ضرورت ہو یا جتنا درد زندگی کے مختلف عناصر میں مناسب طور پر موجود ہو۔ ہمارے ہاں جذبات نگاری اور جذباتیت میں بہت کم فرق پایا جاتا ہے۔ عام افسانہ نگار نہ کبھی جذبۂ عظیم کے قابل ہوتے

ہیں اور نہ اس کے متحمل اس لیے وہ اکثر رکیک اور عامیانہ جذبات کو ہی اس رنگ میں پیش کرتے ہیں کہ لوگ ان سے بہت متاثر ہو جاتے ہیں۔ انہیں نہ ادبی صنعتوں سے کام ہوتا ہے اور نہ نزاکتِ بیان سے غرض۔ وہ جب تک اپنے آپ کو پورے طور پر اس جذبے کے ادا کرنے میں صرف نہیں کر دیتے انہیں چین نہیں آتا حالانکہ مختصر سے مختصر الفاظ میں آپ گہرے سے گہرے جذبے کو اس طریق پر ادا کر سکتے ہیں کہ اس کا دو صفحوں تک پھیلے ہوئے بیان سے قاری پر زیادہ اثر ہو۔

میں نے اس دیباچے میں افسانہ نگاری کے ان دو ایک پہلوؤں پر اس لیے لب کشائی کی ہے کہ ہمارے دوست کرشن چندر صاحب کے افسانوں کو ان اصولوں کی روشنی میں پرکھا جائے۔ کرشن چندر صاحب فطرتاً رومانی واقع ہوئے ہیں اگرچہ وہ موجودہ زمانہ کے سماجی و اقتصادی مسائل سے بے خبر بھی نہیں جیسا کہ ان کے افسانوں "صرف ایک آنہ" اور "مجھے کتے نے کاٹا" اور "قبر" سے ظاہر ہے۔ مگر ان کی فطری شعریت اور کشمیر کی پہاڑیوں سے ان کی روحانی نسبت انہیں روحانیت کی طرف لے جاتی ہے۔ مثلاً ان کے پہلے افسانے "جہلم میں ناؤ پر" کو لیجیے۔ اس میں جو چیز دلکش ہے وہ ان کا بدصورت عورت کا کردار ہے جسے وہ سرسری طور پر بیان کر گئے ہیں۔ اس بدصورت عورت میں جو زندگی ہے وہ ان کی "بیمار لڑکی" میں نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر وہ واقعیت پرست ہوتے تو اس بدصورت عورت کے کردار کی طرف زیادہ توجہ دیتے۔ مگر انہیں وہ نوجوان کالج کی طالبۂ علم زیادہ قابلِ توجہ معلوم ہوئی۔

ان کی روحانیت ان کے افسانے "صرف ایک آنہ" میں، جو ایک اقتصادی قسم کا افسانہ ہے، بھی چھپی نہیں رہتی۔ سروش اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں رات بسر کرتا ہے تو ایک بھکارن اسے کھانا کھلاتی ہے اور اس مروت کے باوجود صبح کو وہاں سے چل دیتی ہے اور سروش سے شکریہ کی طالب نہیں ہوتی۔ "گومال" میں، جب پنڈت جی کو تھانیدار

گرفتار کر کے بیسے جا رہا ہے تو گوماں ایک روپوں سے بھری ہوئی تھیلی لیے ہوئے آتی ہے اور راوی سے کہتی ہے: "بھائی، میرے بھائی کو چھڑا دو"۔ مصنف نے اس سے پہلے ہمیں گوماں کے کردار کے متعلق کچھ نہیں بتایا سوائے اس کے کہ جب پنڈت جی نے اس پر دست درازی شروع کی تو اس نے ان کا منہ نوچ لیا تھا۔ اب گوماں روپے لے کے آتی ہے تو پنڈت جی کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا ہو جاتا ہے اور آگے بڑھ کے وہ گوماں کے پاؤں چھو لیتے ہیں اور نمناک لہجے میں بولتے ہیں: "بس بہن، تمہارے روپے مجھے پہنچ گئے، میں قید سے آزاد ہو گیا"۔ ایسی باتیں اور یہ جذباتی فضا ہم کرشن چندر صاحب کی رومان انگیز دنیا میں بکثرت پاتے ہیں۔ 'مصوّر کی محبت' ایک خالص رومانی چیز ہے اور ایک کامیاب چیز ہے۔ اس میں انھوں نے نہ مبالغے سے اور نہ کسی جذباتی اسراف سے کام لیا ہے۔ شیام سندر کی شخصیت اس کے خطوط سے نمایاں طور پر واضح ہوتی ہے اور بگی سے اس کی دلچسپی جس بتدریج طریقے پر ترقی پکڑتی ہے وہ انھوں نے بہت سچائی سے بیان کی ہے اور پھر اس کہانی کا انجام موزوں اور پراثر ہے۔

مگر یہ کہنا کہ وہ رومان نگاری میں واقعیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں، صحیح نہ ہوگا۔ ان کے افسانے 'قبر' میں کنہیالال کے چھ بڑے بھائیوں کا رکمن سے جو سلوک ہے اسے انھوں نے بہت احسن طریقے سے بیان کیا ہے۔ مثلاً ذیل کی چند ایک سطور ملاحظہ ہوں:

"انسانی ہمدردی کے اس شدید مظاہرے کے وقت میری بھابیوں کی صورتیں دیکھنے کے لائق ہوتی ہیں یا پھر کبھی یوں ہوتا ہے کہ رکمن ہمارے گھر اداس اور غمگین صورت بنائے آئی اور پہلا بھائی: "کیا بات ہے رکمی؟" دوسرا بھائی: "رکمن کیوں کیا بات ہے؟" تیسرا بھائی: "رکمن اداس کیوں ہو؟" چوتھا بھائی: "کیا کسی نے تجھے کچھ کہا ہے؟" پانچویں بھائی کی باری آنے سے پہلے ہی رکمن پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور سسکیوں کے درمیان کہتی جاتی "چچا نے ہاں کر آج پھر پیٹ ڈالا۔ چچا نے..." "چچا نے... ہاں... ہوں" پانچویں بھائی

نے گرج کر کہا: "چچا نے مارا؟ کیوں؟ اُسے کیا حق ہے تمہاری ماں کو پیٹنے کا؟ وہ کہاں سے آیا سالا حرامزادہ شہدا۔ کیوں جی؟ میں پوچھتا ہوں اسے تمہاری ماں کو پیٹنے کا کیا حق ہے؟ وغیرہ۔"

ان چھیوں بھائیوں کا کردار ایک دوسرے سے مختلف نہیں اور نہ ہی مصنف کو ان کی طرف علیحدہ علیحدہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ وہ ان سب کی باتوں سے مجموعی طور پہ ایک خاص اثر پیدا کرنا چاہتے ہیں اور ان کی ہوس کو کنہیا لال کی نوخیز اور جوان محبت کی ضد کے طور پہ پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ اثر پورے طور پہ پیدا ہو جاتا ہے اور جو طنز کہانی کے اس حصے میں پنہاں ہے وہ اس کی واقعیت کو اور بھی دوبالا کر دیتی ہے۔

"اندھے چھتر پتی" میں جہاں چھتر پتی کی مکھنی سے محبت روحانیت کی خوشبو سے لبریز ہے وہیں اس میں واقعیت سے گریز نہیں کیا گیا۔ مثلاً جب چھتر پتی واپس دیس میں آتا ہے تو جس طرح سب لوگ اس کی آؤ بھگت کرتے اور جس طرح بڑی بوڑھیاں اس کے چاؤ بلہار کرتی ہیں وہ قابل تعریف ہے اور جس طرح سب لوگ اس کے سامان کو اس سے بٹورتے ہیں وہ بھی حقیقت سے دور نہیں۔

بلکہ کرشن چندر تو واقعیت نگاری کرتے وقت زندگی کے بعض گھناؤنے تجربات کے استعمال سے بھی پرہیز نہیں کرتے۔ "مجھے کتے نے کاٹا" میں غریب کسان اور اس کی بیوی سے جو برتاؤ ہوتا ہے وہ ان کی نظر میں کھب جاتا ہے اور ایسے ہی "صرف ایک آنہ" میں سرَوش کی بیچارگی اور لوگوں کی بے اعتنائی، بھوک اور افلاس اور بے روزگاری کے جو دردناک مناظر کرشن چندر پیش کرتے ہیں۔ وہ اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ ہماری زندگی کے بدنما اور تکلیف دہ پہلو بھی ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں۔ وہ فقط رنگین خواب ہی نہیں دیکھتے، اُن کی دنیا میں قوس قزح کی سی دلآویز فضائیں ہی نہیں موجود ہوتیں۔ وہ کنہیا لال کی شادی، اس کے بے شمار بچوں اور اس کی محنت اور بیماری اور آنے والی موت

کو بھی اپنی دُنیا میں جگہ دیتے ہیں۔

مگر رومانیت اُن کی طبیعت پر اس قدر حاوی ہے کہ "لاہور سے بہرام گلہ تک" میں جب وہ لولری جھیل کے آبشار کو دیکھ کر واپس آ رہے ہیں تو انہیں ایک خمیدہ کمر اور ناتواں بڑھیا ملتی ہے جو اُن سے بھیک مانگتی ہے۔ جو چیز کرشن چندر صاحب کو اس بڑھیا کے متعلق قابلِ غور اور تعجب معلوم ہوئی ہے وہ اس کا نام ہے۔ اور نام اس کا جیسا کہ وہاں کی عورتوں کا ہوتا ہی ہے 'نور جہاں' ہے اور یہ کہ چاندنی میں اس کے بال چاندی کی طرح چمک رہے تھے۔

کرشن چندر صاحب کے افسانوں میں جو متین ظرافت جگہ بجگہ اپنی جھلک دکھاتی ہے۔ وہ ان کے طرزِ بیان میں اور بھی دلکشی پیدا کر دیتی ہے۔ یہ ظرافت جہاں کہیں بھی موجود ہے بیساختہ اور بے تکلف ہے۔ وہ 'مجھے کتے نے کاٹا' میں ہو خواہ 'لاہور سے بہرام گلہ تک' میں یا 'یرقان' میں۔ اُن کی ظرافت کی سُر مدھم ہے مگر شستہ اور بعض دفعہ اس مسکراہٹ سے مشابہ ہوتی ہے جو آنکھوں ہی آنکھوں میں رہے اور جس سے سوائے لبوں کی ایک خفیف سی جنبش کے چہرے کے نقوش میں اور کوئی حرکت پیدا نہ ہو۔ مثلاً "مجھے کتے نے کاٹا" میں لکھتے ہیں: "میں نے اکثر شریف اجنبیوں کو مسکرا مسکرا کر اپنے آپ سے باتیں کرتے سنا ہے یا چھڑی کو اس طرح زور زور سے تہدیدی انداز میں ہلاتے ہوئے دیکھا ہے گویا کسی غیبی دشمن کے حملوں کا جواب دیا جا رہا ہے۔ اس وقت ان کے بشرے سے اتنی درشتی اور بربریت کا اظہار ہوتا ہے کہ چوک میں کھڑا ہوا پولیس کا سپاہی بھی مشتبہ نگاہوں سے دیکھ دیکھ کر دل میں سوچتا ہے کہ کہیں یہ وہی پاگل خانہ سے بھاگا ہوا سودائی تو نہیں جس کا حلیہ میری ڈائری میں محفوظ ہے۔"
اب اگر آپ اس عبارت کا تجزیہ کریں تو آپ کو اس میں کوئی جملہ بذاتہٖ ظریفانہ نظر نہیں آئے گا۔ مگر آپ ساری عبارت کے پڑھنے سے اپنے دماغ میں ایک ہلکا سا مسرت کا جھونکا محسوس کریں گے۔ ان کا مذاق ہمیشہ مہذب اور بے ضرر ہوتا ہے۔ 'لاہور سے بہرام گلہ تک' میں وہ ایک دفعہ بہت پُرلطف گفتگو لکھتے ہیں خصوصیت سے قربان علی اور چوکی

کے حسین معالدار کے درمیان جو چونچلیں ہوتی ہیں ان میں ظریفانہ رنگ کافی گاڑھا ہوتا ہے۔

ان کے افسانے "یرقان" میں ان تینوں خصوصیات کی آمیزش ہے اور یہ افسانہ میری نظر میں ان کا بہترین افسانہ ہے۔ ظرافت اس کے جملے جملے سے مترشح ہے۔ مندرجہ ذیل سطور ملاحظہ ہوں: "ہمارا قصبہ بہت چھوٹا ہے، اتنا کہ اس میں صرف پانچ حکیم تین ڈاکٹر اور دو وید پریکٹس کرتے ہیں۔ سوڈا واٹر کی صرف ایک دوکان ہے۔ ملائی کی برف بیچنے والا بھی ایک سے زیادہ نہیں اور وہ ایک نوجوان ہے اور منچلا اور شاما کا چاہنے والا۔ شاما کی ماں اس سے ہر روز پاؤ آدھ پاؤ ملائی کی برف مفت کھا جاتی ہے۔ صرف دو درزی ہیں۔ ایک بچارہ بے سیدھا سادا آدمی، وہ قمیص کی سلائی دو آنے تک قبول کر لیتا ہے؛ دوسرا راولپنڈی پاس ہے، اس نے تین سال میں راولپنڈی میں ایک مشہور و معروف انگریزی ٹیلرنگ شاپ میں کام سیکھا ہے، وہ سلائی صرف اتنی طلب کرتا ہے جتنی کپڑے کی قیمت۔ ہمارے قصبے کے نوجوان اس سے بڑے شوق سے کپڑے سلواتے ہیں۔"

اس کے بعد کے پیراگراف بھی بہت دلچسپ اور فنی لحاظ سے بہت کامیاب ہیں۔ ان سے نہ صرف اس قصبے کی زندگی اور شاما اور اس کے چاہنے والوں کا پس منظر قائم ہو جاتا ہے بلکہ اس سے گویا ہماری تہذیب اور طرز تمدن تک کی عکاسی ہوتی ہے اور یہی افسانہ نگاری کا کمال ہے کہ افسانہ واقعیت ہی کی ترجمانی نہ کرے بلکہ زندگی کی مکمل تصویر کی جھلک اس سے آشکارا ہو۔ اس سے لوگوں کی طرز رہائش کا پتا ہی نہ چلے بلکہ وہ اک قوم کی ذہنیت اور اس کے تمدن کی آئینہ داری بھی کرے۔ یہ چیز ان کے افسانے "یرقان" سے ہی نہیں بلکہ کسی حد تک "قبر"، "چھت پتی"، "آنگی" سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ یہی چیز فن افسانہ نگاری کی معراج ہے۔

سب سے آخر میں ان کے طرز بیان اور قدرت زبان کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ کرشن چندر صاحب کی اردو بہت پاکیزہ ہے اور ان کی ترکیبوں میں جدت ہوتی ہے۔ ان کے جملے پڑھ کر خیال اور بعض دفعہ حیرانی ہوتی ہے کہ یہ جملہ کس قدر موزوں اور گویا لازمی ہے۔

چھوٹے چھوٹے جملے ہوتے ہیں مگر ان کے استعمال سے عبارت زندہ ہو جاتی ہے۔ 'جہلم میں ناؤ پر' میں لکھتے ہیں: "ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نغمے کی ہر لَے میں کسی مہجور حسینہ کی روح کھنچی ہوئی چلی آ رہی ہے یا دریائے جہلم کی وسیع چادرِ آب ایک صحرا ہے جس میں ہماری کشتی ڈاچی بنی ہوئی محبوب کی تلاش میں جا رہی ہے، روٹھے ہوئے محبوب کو منانے کے لیے۔ پھر میں نے سمجھا یہ غروبِ آفتاب نہیں، نمودِ سحر ہے۔ مغرب نہیں مشرق ہے۔ روشنی کا منبعِ اعظم ہے۔ ہم غیر فانی انسان ہیں جو اس کبھی غرق نہ ہونے والی کشتی پر سوار ہو کر اپنے محبوب سے ملنے جا رہے ہیں، اپنے ابدی محبوب سے" 'تالاب کی حسینہ' کے آخر میں لکھتے ہیں: "تیرتے تیرتے میں نے سوچا کہ اس زندگی کے بے پایاں تالاب میں ہمیشہ یونہی ہوتا رہے گا۔ یہاں ہنسی کی لہریں ہیں اور موت کے چھینٹے بھی" لہریں اور چھینٹے نہ صرف مناسب ہیں بلکہ چھوتے بھی! ان کی تشبیہیں بھی عموماً بالکل نئی ہوتی ہیں۔ ملاحظہ ہوں: "ان آنکھوں میں ایک ہلکی سی چمک پیدا بھی ہوئی مگر پھر فوراً ہی گم ہو گئی جیسے کوئی حسین سنگریزہ سمندر کے گہرے پانیوں میں کھو جائے" یا "کشتی کے چاروں طرف دور دور تک پانی کی ہلکی ٹوٹتی ہوئی لہروں میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کنول کے لاکھوں پھول کھل گئے ہیں"

'آنگی' میں اس لڑکی کے متعلق لکھتے ہیں: "اب اس کی چال مختلف ہے۔ بازو اب بے پروائی سے نہیں ہل رہے اور گردن ایک طرف کو جھک گئی ہے۔ اب اک نئی تصویر ہے، اک نیا مجسمہ ہے۔ وہ جنگل کی دیوی تھی تو یہ دوشیزۂ سحر ہے۔ اس مجسمے کی تراش نرالی ہے؛ اس تصویر کا رنگ نیا، اس گیت کی لَے انوکھی ہے۔ کاش میں مغنی ہوتا" ایسی تحریر میں جو بے ساختگی اور شعریت ہے وہ کرشن چندر کے طرزِ ادا کی جان ہے۔ ان کا ایک ایک جملہ، جو بظاہر سادہ مگر در اصل پر مطلب اور موزوں ہوتا ہے، دل میں گھر کر لیتا ہے۔ لکھتے ہیں: "نگی کوہستانی گلاب کی ایک کلی ہے، حیا سے سمٹی ہوئی اور پتوں سے چھپی ہوئی" ان کی قوتِ مشاہدہ اور اسلوبِ بیان ہی ان کے لیے شاعروں کی صف

میں جگہ پیدا کر سکتا ہے۔

کرشن چندر صاحب ایک نوجوان افسانہ نگار ہیں اور ان کی تحریر میں، تخیل میں، قوت، تخلیق میں رعنائی اور تازگی موجود ہے۔ ان کا دل بہت حساس ہے اور وہ درد اور تکلیف کو برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ امر ان کے افسانے "صرف ایک آنہ" اور دوسری کہانیوں سے بھی صاف ظاہر ہے۔ ان کی نظر ہر جگہ اور ان کا دماغ زندگی کے ہر پہلو تک پہنچتا ہے۔ وہ ایک دلچسپ شخصیت رکھتے ہیں اور ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ وہ پنجابی ہیں اور اپنی دلکش کہانیوں میں ہماری زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں۔

جہلم میں ناؤ پر

گاٹیالیاں تک سفر نہایت تکلیف دہ رہا۔ لاری مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی اور تمازتِ آفتاب نے اور بھی حبس پیدا کر دیا تھا۔ میں درمیانے درجے میں بیٹھا ہوا تھا اور اپنی قسمت کو کوس رہا تھا کہ کوئی موٹر نہ ملی۔ ورنہ راستہ آسانی سے طے ہو جاتا۔ یوں بھی تمام لاری میں دلبستگی کا کوئی سامان نہ تھا۔ میرے دائیں طرف مرد کی طرح طرہ پھیلائے ہوئے ایک تھانیدار صاحب تشریف فرما تھے جو بار بار مونچھوں کو تاؤ دیئے جاتے تھے۔ سب سے آگے اوّل درجے کی نشست پر، یعنی ڈرائیور کے بالکل قریب، ایک تحصیلدار صاحب جلوہ افروز تھے جن کی خنداں پیشانی اور خوش چہرے سے ان کی دلی طمانیت کا اظہار ہوتا تھا۔ میرے سامنے کی نشست پہ چار عورتیں بیٹھی تھیں: دو بالکل بوڑھی اور دو ادھیڑ عمر کی تھیں مگر جو عورت میرے بالکل مقابل بیٹھی تھی اور جو اپنی گود میں ایک چھوٹے سے بچے کو لیے تھی وہ باقی عورتوں سے کم عمر اور

زیادہ بدصورت تھی۔ وہ کبھی کبھی گھونگھٹ کی آڑ سے مجھے دیکھ لیتی تھی۔ اس دنیا میں ہر کوئی ایک حسین کی تلاش میں ہے۔ یہ تو میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ میں اس کی آنکھوں میں جچ گیا، بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ میں بھی ایک حسین کی تلاش میں تھا۔ میں نے پیشانی کی گرہ ٹھیک کی اور لاری کے اندر چاروں طرف نگاہ دوڑائی مگر آہ! اس مسافروں سے بھری ہوئی لاری میں، جو اپنی زندگی کی منزل پر بے تحاشا بھاگی جا رہی تھی، مجھے کہیں بھی رومان نظر نہ آیا۔ دل برداشتہ چہرے تھے اور حقے یا پھر تھانیدار صاحب کا مُدے چھل۔ میں نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کر لیں اور دل ہی دل میں کہا کہ اس لاری میں سب کچھ ہے مگر حسن ناپید ہے۔ دوسرے لمحے میں جب میں نے آنکھیں کھولیں، تو دیکھا کہ کم عمر بدصورت عورت اپنے چھوٹے بچے پر جھکی ہوئی اُسے نہایت مدھم آواز میں میری گود میں چلے جانے کو کہہ رہی تھی۔

اُس نے اپنی سانولی پیشانی سے پسینے کے قطرے پونچھ کر گھٹے ہوئے لہجے میں کہا:

”آہ میں کس قدر تھک گئی ہوں، میرا سانس گھٹا جاتا ہے۔“

بیچاری غریب عورت! میرا مطلب یہ ہے کہ گو وہ ریشم میں ملبوس تھی اور بے حد بدصورت تھی پھر بھی عورت فطرتاً غریب اور کمزور ہوتی ہے، چنانچہ میں نے چھوٹے بچے کو اپنی رانوں پر لے لیا۔

عورت نے احسان مند نگاہوں سے میری طرف دیکھا پھر کھڑکی سے سر باہر نکال کر قے کرنے لگی۔

عشق کی مجبوریاں، ناچاریاں۔ میں نے جلدی سے ننھے کو تھانیدار صاحب کی آغوش میں دھکیل دیا اور خود اٹھ کر ڈرائیور کو لاری ٹھہرانے کے لیے کہا۔

ڈرائیور بولا: "سرکار یہاں لاری ٹھہرانے سے کیا فائدہ! بس گاٹیالیاں کا گھاٹ کوئی پون میل رہ گیا ہے، وہیں ٹھہراؤں گا، کسٹم کی چوکی پہ دریا کے کنارے، دریا کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سے ان کی طبیعت درست ہو جائے گی۔"

چنانچہ یہی ہوا۔

گاٹیالیاں اور شہر جہلم کے درمیان دریائے جہلم بہتا ہے، اس لیے شہر جہلم کو جانے کے لیے گاٹیالیاں کی چونگی پر عموماً ہر وقت بھیڑ سی لگی رہتی ہے۔ ریاست جموں کو جاتے ہوئے مسافروں کا تانتا، ریاست جموں سے جہلم آئے ہوئے لمبے لمبے چھوٹے ایک چھوٹی سی بندرگاہ کا نظارہ پیش کرتے ہیں۔ اسی بھیڑ بھاڑ میں میں نے تھانیدار صاحب تحصیلدار صاحب اور کم عمر بدصورت کو بھی کھو دیا۔ میرا اسباب مختصر سا تھا اس لیے چونگی والوں سے جلد خلاصی کرالی اور ایک چھوٹے سے قلی پر اسباب لاد کر میں دریا کی سمت چلا۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا گاٹیالیاں تک سفر نہایت تکلیف دہ رہا۔ سر میں درد بھی پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن، اب جوں جوں دریا کے وسیع پانیوں سے ٹھنڈی ہوا کے خوشگوار جھونکے آنے لگے طبیعت صاف ہوتی گئی اور جب دریا کے کنارے پہنچا ہوں تو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ابھی ابھی نہا کر اٹھا ہوں۔ لمبی لمبی دریائی گھاس میں، جو کنارے پر اگی ہوئی تھی، ایک لطیف خوشبو تھی۔ جس نے بے حس نتھنوں کو بیدار کر دیا۔ جہاں تک نظر کام کرتی تھی۔ پانی ہی پانی نظر آتا تھا جس پہ چلتے ہوئے بڑے بڑے چھوٹے اور چھوٹی کشتیاں، ملاحوں کی پُرشور راگنیاں اور لمبی لمبی ڈانڈوں کے پانی کو چیرنے کی مدھم آوازیں، ایک پُرکیف منظر پیش کر رہی تھیں۔

چھوٹے سے دبلے پتلے قلی نے کاڈ کے ایک چھوٹے سے درخت کے نیچے میرا

اسباب اتار کر رکھا۔ اسی درخت کی چھدری چھدری چھاؤں میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی بہت سا اسباب پہ بیٹھے تھے۔ غالباً کشتی کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے قلی کو جیب سے دو نی نکال کر دی اور اس سے پوچھا: "تمہارا نام کیا ہے ؟"

"عبداللہ۔"

"تو عبداللہ ہمیں کہیں سے کشتی کا انتظام کر دو، دیکھو؟ ضرور!"

عبداللہ مسکرا کر کہنے لگا: "صاحب ایک کشتی تو میری اپنی ہی ہے، ٹھہریے، میں اپنے چھوٹے بھائی کو بلاتا ہوں۔ ہم دونوں آپ کو پار لے چلیں گے، ساڑھے تین روپے کرایہ ہوگا۔"

جب عبداللہ چلا گیا تو میں نے زمین پر بیٹھ کر ادھر اُدھر دیکھا: ریت کے بڑے بڑے ٹیلے، کاؤ اور تُمنگ کے درختوں کے جھنڈ، اُڑتے ہوئے ماہی خور، پھر میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف توجہ کی: لڑکی پیٹھ موڑے، دریا کی طرف منہ کیے بیٹھی تھی۔ اس نے ایک گہرے رنگ کی سبز ساڑھی پہن رکھی تھی۔ جس کا کنارہ سنہری تھا۔ لڑکا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے بھورے رنگ کا کوٹ اور ایک خاکی نکر پہن رکھی تھی۔ گلے میں ایک خوش رنگ ٹائی بھی تھی۔ مجھے اپنی طرف مڑتے دیکھ کر کہنے لگا: "آپ کہاں جا رہے ہیں ؟"

"جہلم کے پار ایک گاؤں ہے، وہاں میرا گھر ہے۔ بس وہیں جا رہا ہوں، اور آپ ؟"

میں نے مستفسرانہ نگاہوں سے لڑکی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

لڑکے نے جواب دیا: "ہم لاہور جا رہے ہیں۔ میں تو جموں میں تعلیم پاتا ہوں مگر یہ ۔۔۔۔ میری ہمشیرہ ہیں۔ لاہور ایف اے میں تعلیم پاتی ہیں، انہیں پہنچانے جا رہا ہوں۔ اس سفر میں بہت پریشانی دیکھنا پڑتی ہے۔ اب یہاں ملاح بہت تنگ کرتے ہیں۔ آدھ گھنٹہ سے بیٹھے ہیں کہ کوئی چھوٹی سی کشتی علیحدہ ہمارے لیے مل جائے تو اس میں سوار ہو کر

پار چلے جائیں مگر یہ ملاح لوگ کہتے ہیں کہ کوئی چھوٹی کشتی مرے سے ہے ہی نہیں۔ سب بڑے بڑے بجرے ہیں۔ جن کے دام بھی بہت مانگتے ہیں، آٹھ روپیہ، دس روپیہ۔ یہ تو دن دہاڑے ڈاکہ ہے۔ کتنی پریشانی اٹھانا پڑتی ہے۔"

میں نے اُسے تسلّی دیتے ہوئے کہا: "آپ گھبرایئے نہیں، اب کشتی مل جائے گی میں سب انتظام کیے دیتا ہوں اور ہم آرام سے جہلم پار پہنچ جائیں گے۔"

لڑکی نے میری طرف دیکھا۔ اگر میں یہ کہہ دوں کہ اس جیسا خوبصورت اور بھولا چہرہ میں نے آج تک نہیں دیکھا تو یقیناً ایک جھوٹ ہوگا، لیکن یہ کہہ دینے میں مجھے ذرا بھی تامّل نہیں کہ اس کے چہرے میں کچھ ایسی عجیب کشش اور موہنی تھی جس نے مجھے ایک دم مسحور کر لیا۔ صرف ایک لمحے کے لیے اس نے میری طرف دیکھا پھر وہ گھنی گھنی پلکیں اس کے رخساروں پر جھک گئیں۔ وہ کشمیر کے حسنِ صبیح کا ایک نادر نمونہ تھی؛ دلکش خدوخال؛ سرو قد، دلآویز رنگت۔ لیکن جس چیز نے مجھے زیادہ متأثر کیا وہ اس کی ظاہری خوبصورتی سے بھی بڑھ کر اُس کی نگاہوں کا حزن و ملال تھا جسے میں ایک جھلک ہی میں پا گیا۔ اُف، وہ المناک گہرائیاں! اس ایک لمحے میں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ کسی گہرے سمندر میں ڈوبا جا رہا ہوں۔ پھر یکایک مجھے ٹھوکر سی لگی اور میں نے اپنے آپ کو کنارے پر پایا۔ کس قدر عجیب احساس تھا، مگر یہ احساس صرف ایک لمحے تک ہی محدود تھا۔ دوسرے لمحے میں وہ جہلم کے پھیلے ہوئے پانیوں کی طرف متجسس نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اب اس کا چہرہ صاف اور بھولا بھالا تھا، ہر قسم کے جذبات سے عاری۔ میرے دل پر ایک نیم اضطراری کیفیت طاری ہوگئی۔

اتنے میں اور دو مسافر آکر درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ پہلے ایک بوڑھا آدمی، سفید

ریش، لاٹھی ٹیکتا ہُوا آیا اور "رام رام" کرتا ہُوا میرے نزدیک بیٹھ گیا۔ پھر بچہ اُٹھائے ہوئے وہی کم عمر کی بدصورت عورت نمودار ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک قلی ٹرنک اور گٹھری اٹھائے ہوئے تھا۔ وہ عورت بھی لڑکی کے قریب جاکر بیٹھ گئی اور چھوٹا بچہ سبز ساڑھی کے پلو کو کھینچنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد عبداللہ بھی آگیا اور کچھ وقفے کے بعد اُس کا بھائی ایک کشتی کو کنارے پر لے آیا۔

عبداللہ نے مجھے مسکرا کر کہا: "چلیے کشتی میں بیٹھیے۔"

بوڑھے آدمی نے مخاطب ہو کر کہا: "مجھے بھی لے چلو بابا، رام تمہارا بھلا کرے۔"

بدصورت عورت بھی اُٹھ کھڑی ہوئی کہنے لگی: "اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں بھی اس کشتی میں بیٹھ جاؤں۔ مجھے آج گوجرانوالہ پہنچنا ہے، اگر یہ گاڑی نہ ملی تو پھر۔۔۔ اب شام بھی ہوتی جا رہی ہے اور میں اکیلی ہوں۔"

ہم سب کشتی میں جا کر بیٹھ گیے۔ قلیوں نے مال و اسباب کشتی میں قرینے سے رکھ دیا۔

عبداللہ اور اس کے بھائی نے آستینیں اُوپر چڑھالیں اور ایک ایک ڈانڈ ہاتھ میں لے کر کشتی کے دونوں سروں پر کھڑے ہو گیے۔

اللہ کا نام لے کر کشتی چلی، عبداللہ نے گانا شروع کیا:

"جس داتاں لینا-یاں بیڑا پار دے
ڈاچی والیا موڑ مہار دے"

عبداللہ نے رُک کر پوچھا: "آپ کو میرے گانے پر کوئی اعتراض تو نہیں؟"

لڑکے نے جلدی سے کہا: "نہیں، نہیں، ضرور گاؤ، تمہاری آواز بہت اچھی ہے۔"
عبداللہ نے پھر گانا شروع کیا۔ وہی "ڈاچی" کا پرانا گیت، جسے گانے کے لیے سوز چاہیے ساز نہیں۔

ایک سانڈنی سوار کو صحرا میں سے گزرتے دیکھ کر ایک اداس حسینہ جو اپنے محبوب کی تلاش میں سرگرداں ہے، اسے رک جانے کو کہتی ہے اور پھر اس سے التجا کرتی ہے کہ تو مجھے سانڈنی پر بٹھا کر میرے بچھڑے ہوئے محبوب سے ملا دے:

"ڈاچی والیا! موڑیں مہار وے
ڈاچی والیا! لے چل نال وے"

لڑکے نے آہستہ سے کہا: "ظالم! بہت اچھا گاتا ہے۔ کیا سریلا گلا ہے۔ مجھے گانے کا بہت شوق ہے۔ ذرا سنو تو۔ ۔ ۔"

میں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے بھائی کے شانوں سے سر لگائے ایک طرف بیٹھی تھی۔ آہستہ سے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب یاس انگیز مسکراہٹ آ گئی، نہایت آہستہ سے اس نے اپنے بازو چھاتی پر باندھ لیے اور ٹانگیں پھیلا کر نشست پر لیٹ گئی، اس طرح کہ میں اس کے نصف چہرے کو دیکھ سکتا تھا، اس کے خوبصورت ہاتھوں کو، اس کے نازک ٹخنوں کو۔

"میری ڈاچی دے گل وچ ٹلمیاں
میں تاں ماہی نوں مناون چلیاں"

عبداللہ کی پرسوز آواز نے میرے جذبات کی سوئی ہوئی دنیا میں تلاطم پیدا کر دیا، میرا دل ایک عجیب لذتِ درد کے مزے لینے لگا۔ یہ کیسی خلش تھی! ہلکی، میٹھی۔ ایسا معلوم

ہوتا تھا کہ نغمے کی ہر لَے میں کسی مہجور حسینہ کی روح کھنچی ہوئی چلی آ رہی ہے یا دریائے جہلم کی وسیع چادرِ آب ایک صحرا ہے جس میں ہماری کشتی "ڈاچی" بنی ہوئی محبوب کی تلاش میں جا رہی ہے، روٹھے ہوئے محبوب کو منانے کے لیے۔

میری ڈاچی دے گل وچ ٹلیاں
میں تاں ماہی نوں مناون چلیاں

لڑکی نے چپکے سے ساڑھی کے پلو سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ اُس کے بھائی نے نہیں دیکھا لیکن میں نے اُسے دیکھ لیا۔ کیا ڈاچی کے حسین نغمے نے لڑکی کے دل میں محبت کی دبی ہوئی آگ کو روشن کر دیا تھا! نہیں تو یہ آنسو کیسے؟ میرا دل اس بھید کو جاننے کے لیے بے تاب ہو گیا۔ وہ کس بچھڑے ہوئے محبوب کی یاد میں رو رہی تھی؟ میں نے چاہا کہ میں گلاب کی نرم و نازک پتیوں سے اُس کے آنسو پونچھ ڈالوں اور اس سے پوچھوں: "بتا اے حسینہ! تجھے کیا غم ہے؟"

اس کے بجائے میں نے اُس بدصورت عورت کی شرمائی ہوئی نگاہیں اپنے چہرے پر جمی ہوئی دیکھیں۔ مجھے دیکھ کر اس نے لجا کر اپنی آنکھیں نیچے کر لیں اور اپنے بچے پر جھک گئی۔

چھلک ۔ ۔ ۔ ۔ چھلک ۔ ۔ ۔ ۔ چھلک ۔ ۔ ۔ ۔ چھلک ۔ ۔ ۔ ۔ کشتی بھاگی جا رہی تھی، ڈانڈیں باری باری چل رہی تھیں۔ مغرب میں سورج غروب ہو رہا تھا، دریا میں ڈوب رہا تھا۔ دریا کی خاموش سطح پر ایک عجیب، نازک، نرالی، سحر طراز روشنی پھیل گئی تھی۔ میں نے سمجھا یہ غروبِ آفتاب نہیں نمودِ سحر ہے، مغرب نہیں مشرق ہے، اور روشنی کا منبع اعظم ہے۔ ہم غیر فانی انسان ہیں جو اس کبھی نہ غرق ہونے والی کشتی پر سوار ہو کر اپنے

محبوب سے ملنے جا رہے ہیں۔ اپنے ابدی محبوب سے۔

میں تاں ماہی نوں مناون چلیاں

چپ . . . چپ . . . شپ . . . شپ . . . کشتی بھاگی جا رہی تھی۔

شام ہو گئی۔ اندھیرا بڑھتا گیا۔ عبداللہ خاموش ہو گیا۔ پھر ایک دلکش انداز سے سفید دودھ جیسی بے داغ چاندنی کھل گئی اور مجھے ڈل میں تیرتے ہوئے کنول کے پھول یاد آ گئے۔ کشتی کے چاروں طرف دُور دُور تک پانی کی ہلکی ہلکی ٹوٹتی ہوئی لہروں پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کنول کے لاکھوں پھُول کھل گئے ہیں۔

بوڑھا آہستہ آہستہ "رام رام" جپ رہا تھا، بدصورت عورت دزدیدہ نگاہوں سے کبھی مجھے، کبھی خاموش لیٹی ہوئی لڑکی کو دیکھ لیتی تھی۔ لڑکے نے ایک دو بار اپنی بہن کی طرف دیکھا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: "بچاری شاما، سفر کی تکان سے چور ہو کر آخر سو گئی ہے۔ یہ سفر کتنا پریشان کن ہے۔"

کیا وُہ واقعی سو رہی تھی، یا آنکھیں بند کیے کچھ سوچ رہی تھی؟ وہ بالکل بے حس و حرکت ایک مرمریں مجسمے کی طرح پڑی تھی یا شاید کسی سپنے کی ٹھنڈی چھاؤں میں، ستاروں کی کپکپاتی ہوئی لامتناہی دنیا میں اپنے محبوب سے مل رہی تھی یا پھر اس کی آوارہ روح چاند کی کرنوں میں بھٹکی ہوئی کسی کو تلاش کر رہی تھی۔ ہاں، مگر کس کو؟

آخر ایک طویل عرصے کے بعد اس طویل سکوت کو عبداللہ نے توڑ دیا: "لو وُہ کنارا آ گیا" اس نے ڈانڈ کو زور زور سے ہلاتے ہوئے کہا۔

کنارے پر پہنچ کر میں نے لڑکے سے کہا: "آپ جا کر تانگہ وانگہ درست کریں میں یہاں

قلیوں کا انتظام کرتا ہوں"

تانگے والوں کا اڈا کوئی فرلانگ بھر دور تھا۔ لڑکا تانگے کا انتظام کرنے گیا۔ میں نے عبد اللہ سے کہا: "ذرا کہیں سے قلیوں کو تو بلوا دو"

عبد اللہ کہنے لگا: "اب اس وقت یہاں دریا کے کنارے قلی کہاں سے آئیں گے؟"

"تو پھر اب کیا کیا جائے؟"

"میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ ہم دونوں بھائی دو تین پھیرے لگا کر آپ کا اسباب تانگوں پر رکھ دیں۔ چار آنے فی پھیرا لیں گے"

"اچھا یونہی سہی، اٹھاؤ اسباب۔ اور ان (بدصورت عورت کی طرف اشارہ کر کے) کو بھی اڈے پر لیے چلو"

عبد اللہ کے آخری پھیرے پر میں نے کشتی میں سوئی ہوئی لڑکی کو جگا دیا: "اٹھیے، اب تو جہلم کا دوسرا کنارہ بھی آ گیا"

میری زبان سے پہلا لفظ ادا ہونے پر ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ یقیناً سو نہیں رہی تھی۔ چاندنی رات میں اس کا رنگ زعفران کے پھول کی طرح زرد پڑ گیا تھا اور ہونٹوں پہ وہی یاس انگیز مسکراہٹ تھی۔

میں نے بٹوے سے ایک روپیہ نکال کر کہا: "ایک روپے کا خردہ ہو گا!

اُس نے ہینڈ بیگ کھول کر پیسے نکالے اور مجھے دے دیے۔ وہ نرم و نازک مخروطی انگلیاں برف کی طرح ٹھنڈی تھیں۔

میں نے عبد اللہ کو انعام دیا۔ اُس نے جھک کر ہم کو سلام کیا اور پھر ہماری طرف پیٹھ موڑ کر کشتی میں بیٹھ گیا۔

ہم خاموش چلے جا رہے تھے۔ ہمارے آگے بوڑھا لاٹھی ٹیکتا جا رہا تھا۔ چند قدم چل کر میں نے شاما سے جرأت کر کے پوچھا: "آپ کشتی میں رو رہی تھیں، کیوں؟"

وہ خاموش چلتی گئی؛ سر جھکائے ہوئے۔

میں نے پھر کہا: "میں نے، یقین جانیے، نہایت دلی خلوص سے سوال کیا ہے۔ میں دل سے چاہتا ہوں کہ آپ اپنا دکھ مجھ سے کہہ سکیں اور میں آپ کے کسی کام آ سکوں، کوئی ہرج ہے؟"

اُس نے نمناک نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ یکایک کچھ سن کر وہ ایک ہلکی سی چیخ مار کر ٹھٹک گئی۔ وہ گرنے کو تھی کہ میں نے اُسے ایک بازو سے تھام کر سہارا دیا۔ عبداللہ چاند کی طرف منہ کیے ہوئے گا رہا تھا:

"ساڈی ڈاچی دے گل وچ ڈھولنا
جھوٹے سجناں دے نال کی بولنا

ڈاچی والیا موڑ۔ ۔ ۔"

آواز، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ، دور پرے جہلم کے پھیلے ہوئے پانیوں پر چاندنی کی سحر فشاں کرنوں پر لرزتی ہوئی آ رہی تھی۔ انداز بیان میں بلا کی شوخی تھی اور فقروں میں ایک بے پناہ طنز جو دل کو چھید سے ڈالتی تھی۔ میں نے لڑکی کی طرف دیکھا: وہ کانپ رہی تھی اور جلد جلد قدم اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شاید وہ اس حزیں نغمے کے سیل بے پناہ سے دور بھاگنا چاہتی تھی۔ وہ طوفان جو اُس کی بے قرار روح کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔

باقی راستہ ہم نے خاموشی میں طے کیا۔

جب میں انہیں تانگوں پر سوار کرچکا تو لڑکے نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا: "شکریہ! بہت بہت شکریہ! ہم نے آپ کو بہت تکلیف دی۔ کیا آپ کا گاؤں یہاں سے نزدیک ہے؟"

"بس کوئی تین چار میل ہوگا۔ وہ سیدھی پگڈنڈی جا رہی ہے، پیدل ہی جانا ہوگا۔"

بدصورت عورت نے میری طرف دیکھ کر ہاتھ جوڑے اور پھر سر جھکا لیا۔

میں نے ہاتھ جوڑ کر سر جھکایا، دو دفعہ، ایک دفعہ بدصورت عورت کو دیکھ کر اور آخری بار لڑکی کو دیکھ کر۔ لڑکی نے میری طرف مبہم، خمار آلود، اندوہگیں نگاہوں سے دیکھا۔ وہ نگاہیں شاید کھل کر دل کا راز کہہ دینا چاہتی تھیں مگر کامیاب نہ ہو سکیں ان آنکھوں میں ایک ہلکی سی چمک پیدا بھی ہوئی مگر پھر فوراً ہی گم ہو گئی، جیسے کوئی حسین سنگریزہ سمندر کے گہرے نیلے پانیوں میں کھو جائے۔ اس کا داہنا بازو تھوڑا سا اوپر اٹھا اور پھر نیچے گر گیا۔ چوڑیوں کی جھنکار پیدا بھی ہوئی اور پھر ایک لمحے میں لرزتی ہوئی کہیں غائب ہو گئی، جیسے آسمان سے کوئی تارا ٹوٹے اور فضا میں گھل جائے۔ اب وہ نظر نیچی کیے ساڑھی کا پلو ٹھیک کر رہی تھی۔

"گڈ بائی!" میں نے جلدی سے کہا۔

تانگا چلنے لگا، لڑکے نے زور سے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا: "گڈ بائی۔"

سیدھی، کھیتوں کے بیچوں بیچ پگڈنڈی جا رہی تھی؛ آسمان پر ستاروں کے درمیان بھی اسی طرح ایک پگڈنڈی بنی ہوئی تھی۔ "یہ سفر کب شروع ہوا؟" میں سوچنے لگا: یہ دونوں پگڈنڈیاں کدھر جا رہی ہیں؟ یہ سفر کبھی ختم ہوگا؟

اندھا چھتری

یوں تو شہر میں کئی اندھے بھکاری گھومتے رہتے تھے لیکن جو لطف ہمیں اندھے چھتری کو چھیڑنے میں آتا تھا وُہ کسی اور گداگر کو ستانے سے میسر نہ ہو سکتا تھا۔ کہنے کو تو بھگت بھی اندھا ہی تھا لیکن آنکھیں رکھنے والوں سے بھی چالاک۔ بازاروں اور گلیوں میں اس طرح بے خطر ہو کر چلتا تھا گویا سارا شہر اس کی ملکیت ہے۔ اُس کی آنکھوں کے پپوٹے لال لال اور ڈراؤنے تھے۔ اُس کے سامنے کھڑے ہو کر اُسے تنگ کرنے کی جرأت ہمیں بالکل نہ تھی اور پھر اُس کے پاس ایک بہت بڑا خطرناک سوٹا ہوتا تھا جسے وہ غیظ و غضب کی حالت میں زور زور سے گھمایا کرتا تھا۔ اگر کوئی لڑکا ڈنڈے کی زد میں آگیا، بس اُس کی خیر نہ تھی۔ اسی طرح کئی پٹ چکے تھے اور کئی پٹتے پٹتے بچ جانے سے بال بال بچے۔

لیکن اندھا بھگت جتنا خطرناک تھا چھتری اتنا ہی سیدھا سادا، غریب طبیعت

کا مالک تھا۔ وہ بڑی آسانی سے ہمارے ہتھے چڑھ جایا کرتا تھا۔ پھر ہمیں اس سے کوئی اتنا ڈر بھی تو نہیں لگتا تھا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں بالکل ہماری طرح تھیں اور آنکھوں کی سپیدی بھی دودھ کی طرح بے داغ نظر آتی تھی، پپوٹوں کا رنگ بھی سُرخ اور ڈراونا تھا۔ اُسے آج تک کسی نے بات کرتے نہ سنا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اندھے بھگت کی طرح ہر وقت ایک موٹا سا ڈنڈا ہوتا تھا جسے وہ صرف انتہائی ضرورت کے موقعے پر اپنے آپ کو بچانے کے لیے استعمال کرتا تھا۔

شہر میں جتنے بھی فقیر تھے ہر ایک کو چڑانے کے لیے اُن کے الگ الگ نام رکھ دیتے تھے۔ لمبا تڑنگا، گیروے کپڑے پہنے ہوئے ایک باوا تھا، ذات کا برہمن تھا اور بہت کڑوا مزاج رکھتا تھا چنانچہ اسے سب "باوا کریلا" کہہ کر پکارتے تھے۔ آپ خیال کرتے ہوں گے کہ وہ اس نام سے بہت خوش ہُوا ہوگا اور اس نے ہماری جدّتِ طبع کی داد دی ہوگی، ہرگز نہیں، بلکہ وہ یہ نام سُن کر چڑ جاتا تھا۔ "باوا کریلا آیا، باوا کریلا، باوا کریلا" اسی طرح چیختے پکارتے درجنوں بچے اس کے گرد جمع ہو جاتے تھے اور اور اس سے جی بھر کر گالیاں سنتے تھے۔ "حرام زادے میں کیا کریلا ہوں! تمہارے باپ کریلے ہیں، تمہاری مائیں، تمہاری بہنیں، تم سب کریلے ہو، خدا تمہیں غارت کرے!"

اور لڑکے ہنستے، خوش ہوتے تالیاں بجاتے۔

ایک لڑکا پھر چیخ کر سناتا "او۔۔۔ باوا۔۔۔ کریلا"

دوسرا نقل کرتا: "گاڑی لوگے ٹھیلہ؟"

تیسرا: "پیسہ لوگے دھیلہ؟"

چوتھا: "او۔۔۔ باوا۔۔۔ کریلا!"

اور بابا کہ یہ سُن کر دانت پیستا، اس کے لب کف آلود ہو جاتے: "حرام زادو ٹھہرو، جاتے کہاں ہو" یہ کہہ کر وہ اپنی لکڑی کی کھڑاویں اتار کر ہماری طرف پھینکتا اور ہم قہقہے لگاتے ہوئے تتر بتر ہو جاتے۔

ایک کا نام سائیں منگا تھا، از بس کہ وہ ہمیشہ ننگا رہتا تھا۔ زود الاعتقاد لوگ اسے پیر اور عاقل مانتے تھے۔ وہ صرف گوشت کھاتا تھا اور وہ بھی کچا۔ بچے عموماً ہر قسم کے توہمات سے آزاد ہوتے ہیں۔ اُسے چڑانے کا ڈھب بھی ہمیں آگیا۔ ایک دن ایک لڑکے نے اسے کہہ دیا: "سائیں منگا، اُو، اُو، اُو" تو سائیں صاحب اُس کی طرف پتھر لے کر دوڑ پڑے، بس اب کیا تھا، جدھر سائیں صاحب جاتے "منگا اُو، اُو، اُو" کہہ کر لڑکے آسمان سر پر اٹھا لیتے۔

یا پھر چوہدری ہر بھیج بھی ایک نرالا فقیر تھا۔ اسے اپنے نام سے بہت پیار تھا اور بس یہی نام ہی آخر اس کی بدقسمتی کا باعث بن گیا۔ نام تھا ہر بھیج، لڑکوں نے "گیدڑ" کہہ پکارنا مناسب سمجھا۔ بازار میں، گلی میں، سڑک پر جہاں کہیں وہ مل گیا۔ بس لڑکوں نے "گیدڑ، گیدڑ" کہہ کر اُسے تنگ کرنا شروع کیا۔

ایک کہتا: "ہر بھیج"

دوسرا جواب دیتا: "گیدڑ"

پھر سب مل کر کہتے: "ہر بھیج گیدڑ، ہر بھیج گیدڑ"

ہر بھیج گالیاں دیتا، لڑکوں کو پیٹتا، کئی بار اپنی چھاتی کوٹنے لگ جاتا۔

ایک دن بازار سے گزر رہا تھا۔ ایک دوکان پر چند بے فکر نوجوان دکاندار تاش کھیل رہے تھے۔ ایک ساتھی نے اپنے دوسرے ساتھی سے پتہ پھینکتے ہوئے کہا: "کالی ڈیری"

ہرنبج نے سمجھا اُسے کسی نے "مائی ڈیر" کہہ کر مخاطب کیا ہے بس پھر کیا تھا، وہیں کھڑا ہو کر گالیاں دینے لگا: "تم مائی ڈیر، تمہارا باپ مائی ڈیر، میرا نام ہرنبج ہے، میرے باپ کا نام رام بھیجا تھا۔ وہ تحصیل میں چپڑاسی تھا۔ ہم برہمن ہیں۔ شرم نہیں آتی تمہیں۔"

ایک نوجوان بولا: "ہرنبج۔"

دوسرے نے جواب دیا: "مائی ڈیر۔"

اب ہرنبج جدھر سے گزرتا اُس پر مائی ڈیر کے آوازے کسے جاتے۔ پھر تو یہ شغل ہو گیا کہ اس کے لیے ہر روز ایک نیا نام تجویز ہوتا تھا اور ہر روز اسے تنگ کیا جاتا۔

ہاں لیکن چھترپتی ان سب سے نرالا تھا۔ وہ ہمیشہ خاموش رہتا۔ آہستہ آہستہ راستہ ٹٹولتے ٹٹولتے گزر جاتا۔ اُسے چڑانے کے لیے ہم نے اپنے سب گُر آزمائے لیکن بے سود۔ آخر ایک دن جب ہم سب اس کے گرد گھیرا ڈالے اُسے تنگ کرنے کے لیے اپنی تمام تر کوششیں صرف کر رہے تھے ایک اجنبی ہمارے راستے سے گزرا۔ پہلے تو وہ بہت دیر تماشا دیکھتا رہا پھر آہستہ سے جھک کر اُس نے ایک لڑکے کے کان میں کہا: "اس کے قریب جا کر اونچی آواز میں کہو مکھنی، ہائے مکھنی، ہائے مکھنی۔"

اُس لڑکے نے ایسا ہی کیا۔

پھر ایک عجیب نظارہ دیکھنے میں آیا۔ چھترپتی زور زور سے ڈنڈا گھمانے لگا۔ جوں جوں لڑکے چلا چلا کر مکھنی کا نام لے کر پکارتے چھترپتی کی حالت بگڑتی جاتی، وہ زور زور سے چیخنے لگتا اور ڈنڈا گھماتا۔ اب ہم سب مکھنی مکھنی کہہ کر اُس کے گرد ناچ رہے تھے۔ مسرت کی کنجی ہمارے ہاتھ آ گئی تھی۔ اُس کنجی کا نام تھا مکھنی۔

بہت مدت کے بعد آج چھتر پتی پھر ہمارے ہتھے چڑھا۔ وہ اکثر کئی کئی دن غائب رہتا تھا۔ یونہی کسی جگہ چپکا پڑا رہتا۔ اگر کوئی ترس کھا کر سوکھا ٹکڑا دے دیتا تو لے لیتا۔ ورنہ بھوکا ہی پڑا رہتا۔ آج کئی دنوں کے بعد نظر آرہا تھا۔ آہستہ آہستہ لاٹھی ٹیکتے ہوئے کشمیری محلے سے باہر نکل رہا تھا کہ لڑکوں کی نظر پڑ گئی:

"ارے وہ رہا۔"

"کون؟"

"چھتر پتی۔"

"ارے منّو، دلو، شریف، موہن، چھتر پتی آیا، وہ چھتر پتی آیا۔"

شریفہ کی اماں نے شریف کو دامن سے پکڑ کر گھر کے دالان کے اندر گھسیٹنا چاہا:

"بیٹا مت جاؤ۔ فقیروں کو چھیڑا نہیں کرتے۔"

"ہنہ" کہہ کر شریف بھاگ آیا۔ پل بھر میں بیس پچیس لڑکے چھتر پتی کے گرد جمع ہو گئے:

"چھتر پتی تمہارا نام کیا ہے؟"

"چھتر پتی تم اتنے دنوں کہاں رہے؟"

"چھتر پتی یہ سونٹا تم ہمیں دے دو۔"

"چھتر پتی تم بولتے کیوں نہیں؟"

چھتر پتی کے جسم پر چٹکیاں لی گئیں، چھتر پتی کو چھوٹے چھوٹے کنکروں کا نشانہ بنایا گیا، چھتر پتی کو اِدھر اُدھر گھسیٹنے اور اس کا سونٹا چھیننے کی ناکام کوشش کی گئی لیکن وہ ٹس

بھی نہ ہُوا۔ یوں وہ بہت گھبرایا ہُوا معلوم ہوتا تھا اور ہمارے نرغے سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں اس قدر تنگ کرنے پر بھی خاموش تھا۔

اس کی یہی خاموشی ہمیں مجبور کر رہی تھی۔

آخر ہم نے آخری حربہ استعمال کیا: "چھڑ پتی! مکھنی! مکھنی!"

چھڑ پتی پہلے تو بالکل چپ رہا، معلوم ہوتا تھا کہ اپنے آپ پر جبر کر رہا ہے، پھر اُس کی حالت متغیر ہوتی گئی۔ وہ کانپنے لگا اور ہمارے نرغے سے نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن ہم اُسے کہاں جانے دیتے تھے "مکھنی، مکھنی، مکھنی۔" آخر وہ چیخیں مارتا ہُوا انتہائی جوش کی حالت میں ہمارے نرغے کو توڑ کر نکل آیا۔ ہم اس کے پیچھے پیچھے "مکھنی، مکھنی" کہہ کر بھاگنے لگے۔ اب وہ سونٹا گھماتے ہوئے تیزی سے دوڑنے لگا۔ ہم اس کے پیچھے بھاگتے گئے۔ یکایک بھاگتے بھاگتے اسے ٹھوکر لگی اور وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ اس کے گھٹنے سے خون بہنے لگا۔ اُسے اس طرح زخمی دیکھ کر سب لڑکے اِدھر اُدھر بھاگ گئے

اُس رات غریب چھڑ پتی کو ستانے کے جرم کی پاداش میں بہت سے لڑکے پیٹے گئے۔ دیوان خانے کا دروازہ بند کر کے بڑے بھائی نے لاتوں اور مکوں سے میری خوب مرمت کی "غریب اندھوں کو ستاتے ہو۔ ایک دن تمہارا بھی یہی حال ہوگا" وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس قسم کی دقیانوسی باتوں کا ہم پر کیا اثر ہوتا، الٹا میں نے تہیہ کر لیا کہ چھڑ پتی کو، اندھے بھگت کو، سائیں منگے کو، غرضیکہ شہر کے ہر ایک بھکاری کو اب خوب دِق کیا جائے گا۔ کم بخت ہمیں پٹواتے ہیں۔ ٹھہرو تو بچہ جی، اب دیکھیں تم ہم سے بچ کر کہاں جاتے ہو؟ اسی طرح میں دیوان خانے کے ایک کونے میں پڑا سسکیاں لیتا ہُوا سوچتا رہا۔ ایک

دفعہ ماما کھانے کا بلاوا دینے کے لیے بھی آئی: "چلو، ماں جی تمہیں کھانے پر بلاتی ہیں۔" میں نے انکار کر دیا: "مجھے بھوک نہیں ہے۔" پھر بہت دیر گزری میں انتظار کرتا رہا لیکن کوئی مجھے منانے کے لیے نہ آیا؛ نہ بڑا بھائی، نہ پتاجی، نہ ماں۔ آہ! اس دنیا میں ایک غریب لڑکے کو کوئی نہیں پوچھتا۔ یہ لوگ کتنے سنگدل ہیں۔ یہ خیال آتے ہی میری ہچکیاں اور بھی تیز ہو گئیں۔ میں نے سوچا کہ میں اگر یہاں سے اسی دم بھاگ جاؤں کہیں دور، تو پھر یہ لوگ میری تلاش کریں گے، بڑے بھائی دستِ تاسف مل کر کہیں گے "میں نے اسے کیوں مارا۔" والدہ کہے گی: "یہ سب تیرا ہی قصور ہے، اب تو ہی اسے ڈھونڈ لا۔ میں اپنا لال تجھ سے لوں گی۔" اور بڑے بھائی حیران ہو کر میری تلاش میں مارے مارے پھریں گے، مگر کیا میں ان کو مل سکوں گا؟ ہرگز نہیں! میں بہت دُور دور۔۔۔" اتنے میں دیوان خانے کا دروازہ کھلا۔ پتاجی، بڑے بھائی اور تین چار اُن کے دوست اندر داخل ہوئے۔ بہت ہشاش بشاش نظر آتے تھے۔ کسی نے میری طرف توجہ بھی نہ کی۔ میں اپنے کونے میں سکڑ کر لیٹا رہا۔ کوئی حقہ پی رہا تھا، کوئی تاش کھیلنے لگا، کوئی اخبار اٹھا کر دیکھنے لگا۔ یکایک اخبار پڑھنے والے آدمی نے بڑے بھائی سے مخاطب ہو کر کہا: "آج میں نے چھتر پتی کے متعلق چند ایک دلچسپ باتیں سنیں۔ بڑی عجیب داستان ہے، سنو گے؟"

سب لوگ ہمہ تن گوش ہو گئے۔ حقے کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ اس نے چھتر پتی کی داستانِ حیات سنانی شروع کی:

چھتر پتی ذات کا برہمن ہے اور سیکو گاؤں کا رہنے والا ہے جو گلمرگ سے پینتیس میل کے فاصلے پر مغرب کی طرف واقع ہے۔ اُس کے ماں باپ بچپنے ہی میں اسے داغ

مفارقت دے گئے۔ رشتہ داروں نے اُس تھوڑی سی زمین پر بھی قبضہ کر لیا جو
ساہوکاروں کی دست برد سے بچ کر چھتر پتی کے حصے میں آئی تھی۔ اب چھتر پتی گاؤں
کا یتیم تھا۔ وہ ہر کسی کو اپنا چچا کہتا، کھیتوں میں کام کرتا، چشمے سے پانی کے گھڑے بھر کر
اپنے رشتہ داروں کے ہاں لے جاتا، ریوڑوں کی رکھوالی کرتا، لوگوں کے کپڑے
دھوتا۔ غرضیکہ اسی قسم کے درجنوں کام کرتا۔ اس کے عوض میں اسے روٹی مل جاتی
تھی اور کبھی کبھی پہننے کے لیے گاڑھے کی ٹوپی بھی، کبھی کوئی اسے ایک سیاہ رنگ کے
کپڑے کی قمیص سلوا دیتا اور کبھی کوئی پاجامہ۔ اسی طرح اپنے مہربان چچوں کے درمیان
وہ پلتا رہا اور اٹھارہ برس کا ہو گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ چھتر پتی اپنی جوانی میں بہت خوبصورت
تھا: کڑیل، تنومند، طبیعت کا صاف۔ کام تو وہ اب بھی ہر ایک کا پورا کر دیتا تھا۔ لیکن
اب شباب کے ساتھ اس میں خودداری کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا اور اُس کا پہلا ثبوت یہ تھا
کہ اُس نے گاؤں کی نوجوان اور طرحدار لڑکیوں کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھنا شروع کر دیا
تھا۔ گاؤں کے یتیم کو اس سے پہلے اس قسم کی جرأت کبھی پیدا نہ ہوئی تھی اور نہایت افسوس
سے کہنا پڑتا ہے کہ سبکلو کی گلاب کی کلی کی طرح حسین و نازک دوشیزائیں بھی اس سے نہایت
ملاطفت سے پیش آنے لگیں، اور خاص کر لکھنی جو گاؤں کی لڑکیوں میں سب سے بانکی،
پیاری اور البیلی لڑکی تھی۔ پہلے جب وہ اس سے ملتی تھی تو اول تو اس سے بات بھی
نہیں کرتی تھی اور گردن بلند کیے ہوئے، کمر جھٹکا کر، وحشی ہرنی کی طرح قریب
سے گزر جاتی تھی لیکن اب؟ آہ! اب چھتر پتی کو ایسا معلوم ہوا کہ لکھنی کی تمام ادائیں صرف
اسی کے لیے تھیں۔ اس کی نرم ملائمت سے بھری ہوئی نگاہیں، اُس کے خمیدہ لبوں کا
ہلکا، عجیب سا تبسم۔ اب وہ اس سے سخت کلامی سے پیش نہیں آتی تھی۔ کوئی لڑکی

کبھی اب اُسے تند و ترش لہجے میں مخاطب نہیں کرتی تھی لیکن ملکھنی کی باتوں میں کچھ اور ہی رس تھا۔ نوزائیدہ محبت کی پہلی جھلک، پہلے پیار کا انوکھا مزہ، شیریں زبان، لوچ دار آواز، پیارے پیارے ننھے ننھے فقرے۔ ہنستے ہوئے، شرماتے ہوئے وُہ اس طرح باتیں کرتی جیسے منہ سے پھول جھڑ رہے ہوں۔ کبھی کبھی چشمے کے کنارے پر، کبھی کسی لہلہاتے ہوئے دھان کے کھیت کے قریب، کبھی بند گھاٹیوں پر لمبے لمبے دیودار کے درختوں کے درمیان ریوڑ چراتے ہوئے وہ اُسے مل جاتی تھی: پاک، بیباک، نڈر، جنگل کے جانوروں کی طرح معصوم۔ یکایک چھتریؔ کو دنیا میٹھی اور مہربان نظر آنے لگی۔ آسمان پر بھاگتے ہوئے سفید بادلوں کو دیکھ کر اس کا دل کسی نامعلوم مسرت سے کانپنے لگتا۔ جنگل کے جھرنوں کی آواز میں اس نے ابدی زندگی کے نرالے اور سحر طراز گیت سُنے اور پھر خود اس کی اپنی زندگی کے تار اُن پُرمسرت نغموں کی لَے سے جھنجھنا اُٹھے۔

مگر چھتریؔ کے چچوں کو اس کی خودداری اور سیکلو کی ماہ جبینوں کی شیریں کلامی ایک لمحہ نہ بھائی۔ کیا ہُوا اگر وہ خوبصورت جوان تھا۔ آخر وہ اُن کے ٹکڑوں پر ہی پل کر جوان ہُوا تھا۔ گاؤں کے یتیم کی گستاخ نگاہیں لوگوں کے دلوں میں تیز نکیلے بھالوں کی طرح چبھنے لگیں۔ کیا اس کے پاس ایک بالشت بھر بھی زمین تھی؟ ایک گائے، ایک بھینس، ایک بکری؟ اس کے پاس تو کچھ بھی نہ تھا۔ اُسے کیا حق تھا کہ وہ گاؤں کی پری چہرہ عورتوں سے ہنس کر بات کرے، اور شادی؟ اس کے ساتھ شادی کرنے سے تو یہی بہتر تھا کہ بیوقوف لڑکی کو کسی دیودار کے ساتھ باندھ دیا جائے۔ دونوں صورتوں میں اسے فاقوں سے ہی تو مرنا تھا۔

چنانچہ ایک دن گاؤں کی پنچایت نے، جو بڑے بوڑھے برہمنوں پر مشتمل تھی، فیصلہ کر کے اسے گاؤں سے باہر نکال دیا۔

دو سال کے بعد جب چھترپتی پردیس سے واپس آیا تو گاؤں والوں نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ مکھنی کا باپ خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ ساتھ ہی چھترپتی کو معلوم ہوا کہ اس عرصے میں اس کی کئی ایک خالائیں، پھوپھیاں اور چچیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ بات یہ تھی کہ چھترپتی دو تین سو روپے پردیس سے کما لایا تھا اور پھر اس کے پاس کپڑوں اور دیگر اشیا سے بھرے ہوئے تین چار ٹرنک بھی تھے اور ایک نہایت ہی خوبصورت بسترا۔ ایسا خوبصورت بسترا۔ . . . . . . آج تک گاؤں کے مردوں اور عورتوں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ گول گول خوشنما تکیے، ریشمیں چادریں اور ایک چمکتا ہوا لحاف۔ ایسا خوبصورت بستر تو نمبردار کے گھر پر بھی موجود نہ تھا۔ وہی گاؤں کے بوڑھے برہمن، جنہوں نے اسے گاؤں سے باہر نکال دیا تھا، اب فرطِ محبت سے اس کے سر پر بار بار ہاتھ پھیرتے تھے اور اسے دیکھ دیکھ کر نہال ہوئے جاتے تھے۔ بڑی بوڑھی عورتیں ایک دوسرے سے باتیں کرتی ہوئی کہتی تھیں: "سنا ہے ہمارا چھترپتی (ہر ایک عورت ہمیشہ "ہمارے چھترپتی" پر بہت زور دیتی تھی) میرٹھ میں ایک دوکان کا مالک ہے۔ وہ وہاں، کیا نام ہے، موٹر اور بائیسکل ٹھیک کرتا ہے۔ کتنا اچھا لڑکا ہے۔ ارے بھلا اس کی عمر کیا ہو گی۔ بس ہماری نہالو کی عمر کا ہو گا۔"

اور دوسری بوڑھی چچی منہ پھلا کر کہتی: "وہ کیسے؟ تمہاری نہالو تو اس سے عمر میں دو تین سال بڑی ہے۔ وہ بیچارہ تو بس میری بھاگو کی عمر کا ہو گا!"

اسی طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ چھترپتی نے اپنی دولت خوش ہو کر دونوں ہاتھوں سے لٹائی۔ اکیلا مکھنی کا باپ دو سو روپے "قرض" کے بہانے لے کر ہضم کر گیا۔ ٹرنکوں سے بھرے ہوئے کپڑے خالاؤں اور بڑی بہنوں اور پھوپھیوں نے ہتھیا لیے اور وہ خوبصورت بستر نمبردار نے عاریتاً مانگ لیا کیونکہ اس کے ہاں ایک شہری مہمان اتفاقاً آ نکلا تھا۔ بیچارا چھترپتی مکھنی کے باپ سے "رشتہ" طلب کرتا رہا اور مکھنی کا باپ اسے ہر روز ٹالتا رہا اور آخر جب چھترپتی کے پاس کچھ نہ رہا تو مکھنی کے باپ نے اسے کہہ دیا:
"بھئی ابھی تو نہیں۔" بیاہ کا بہت سادھندا کرنا ہے اور میں تم جانتے ہو غریب آدمی ہوں اگلے سال . . . .

"بہت اچھا" چھترپتی نے سر جھکا کر کہا۔

"اور ہاں، مکھنی کا باپ بولا، "بات تو اب پکی ہو گئی ہے، مجھے تم ہر مہینے کچھ نہ کچھ بھیجتے رہنا کیونکہ آخر بیاہ کرنا ہے، جہیز بھی ہو گا اور برادری کو دعوت بھی دینا پڑے گی۔"

رات کو پٹواری کے ہاں رت جگا تھا۔ گاؤں کی عورتیں اور مرد پٹواری کے گھر کے آنگن میں اور دالان میں اور کمروں میں جمع تھے، ڈھولک بج رہی تھی اور رس سے بھرے ہوئے گلاس اور میٹھی روٹیاں تقسیم ہو رہی تھیں۔ حقوں کی گڑگڑاہٹ، بوڑھوں کی کھانسی، نوجوانوں کے قہقہے، بچوں کا شور و غل۔ سبھی کچھ موجود تھا۔ اسی چہل پہل میں ادھر ادھر گھومتے ہوئے چھترپتی اور مکھنی دونوں پٹواری کے گھر سے باہر نکل آئے اور ایک ہرے کھیت کے کنارے پتھر کی ایک چوڑی سی سل پر بیٹھ گئے۔ یہاں ایک چھوٹا سا چشمہ تھا اور ایک پتلا سا شمشاد کا پیڑ جس کی ایک لمبی ٹہنی چشمے پر جھکی تھی۔

چھترپتی نے ایک لمبی سانس لے کر کہا "میں کل واپس میرٹھ چلا جاؤں گا۔"

مکھنی چھتر پتی کے قریب ہو گئی، کانپتی ہوئی آواز میں بولی: "وہ کیوں؟"
"تمہارے پتا جی کہتے ہیں کہ ہماری شادی اگلے سال ہو گی۔ اب انہوں نے مجھ سے پکا وعدہ کر لیا ہے۔"

کتنی ہی مدت تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

چھتر پتی نے مکھنی کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ "میں بہت خوش ہوں مکھنی!"
"ایک سال کا عرصہ بھی کیا ہوتا ہے، جلد بیت جائے گا۔ اس کے بعد۔۔۔ اس کے بعد۔۔۔ مکھنی؟"

اس کے بعد۔۔۔ مکھنی نے شیریں لہجے میں کہا۔

وہ دونوں چپ ہو گئے اور اسی طرح بیٹھے بیٹھے آنے والے زمانے کے زرّیں خواب دیکھنے لگے۔ شمشاد کے نازک پتوں کے سائے پانی کی سطح پر کانپ رہے تھے۔ آسمان کے نیلے چشمے پر چاند اور ستارے پھولوں کی طرح کھلے ہوئے تھے اور مشرق سے ہواؤں کے لطیف جھونکے آ رہے تھے جن میں گلمرگ کے جنگلی پھولوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ کھیت کے دوسرے کنارے پر سے لڑکیوں کے گانے کی آواز آ رہی تھی:

کرڈھٹیا ھنی چلے۔۔۔

کرڈھٹیا ھنی چلے بنجارے

ہائے کُن چینسی پھلیاں

ہائے کُن چینسی کلیاں

کُن چینسی پچگوارے

ھنی چلے بنجارے

کرڈھٹیا ھنی چلے۔۔۔

سکھ کی دنیا میں کھوئے ہوؤں کو یکایک بلند قہقہوں کی آواز نے جگا دیا۔ انھوں نے مڑ کر دیکھا تو مکھنی کی چند سہیلیاں ان کے سر پر کھڑی تھیں، ہنستی ہوئی دہری ہوئی جا رہی تھیں:

"اری مکھنی، بے شرم!"

مکھنی بیدِ مجنوں کی شاخ کی طرح لچکتی ہوئی اُٹھی اور ایک زقند لگا کر اپنی سہیلیوں میں شامل ہو گئی۔ اُس نے شرم سے اپنا منہ چھپا لیا اور سہیلیاں اب اُسے مکوں سے کوٹنے لگیں۔ پھر ذرا ٹھہر کر وہ چھترپتی کی طرف مڑیں اور اُسے گیتوں ہی گیتوں میں پیاری پیاری گالیاں سنانے لگیں۔ چھترپتی مسکراتا ہوا سب کچھ سنتا رہا۔

اب داستان تھوڑی سی رہ گئی ہے۔ چھترپتی نے وہ سال جس طرح گزارا یہ کچھ اُسے ہی اچھی طرح معلوم تھا۔ ہر مہینے وہ اپنا پیٹ کاٹ کر جس طرح بھی ہوتا تیس پینتیس روپے مکھنی کے باپ کو بھیج دیتا تھا۔ ہر مہینے اُسے مکھنی کے باپ کے ایک دو خط آ جاتے تھے جس میں اُس کی آنے والی شادی کا تذکرہ ہوتا تھا اور مزید روپوں کا تقاضا بھی۔ پہلے سات مہینے تو اُسے برابر خط آتے رہے مگر پھر یکایک خط آنے بند ہو گئے۔ لیکن چھترپتی متواتر روپے بھیجتا رہا۔ آخر جب سال ختم ہونے کو آیا تو اُس نے واپس گھر جانے کی تیاری کی۔ خوشی خوشی وہ واپس گھر لوٹا۔ خطوں کا نہ آنا اس کے لیے چنداں اہمیت نہ رکھتا تھا۔ "ممکن ہے،" چھترپتی نے سوچا، "کہ مکھنی کا باپ اب شادی کی تیاریوں میں بہت مصروف ہو۔"

اور یہ تھا بھی سچ۔ مکھنی کا باپ شادی کی تیاریوں میں بہت مصروف تھا۔ جلد ہی مکھنی کی شادی ہو جانے والی تھی۔ لیکن چھترپتی سے نہیں۔ بلکہ گاؤں کے ادھیڑ عمر کے نمبردار

سے۔ اور پھر اس میں تعجب کی کیا بات تھی: وہ گاؤں کا نمبردار تھا اور گاؤں میں پٹواری کے بعد سب سے امیر۔ خود پٹواری بھی اس کی بات بہت کم ٹالتا تھا اور پھر مکھنی کے باپ کو روپیوں کی سخت ضرورت تھی، وہ دھان کے لیے آبی زمین کے دو قطعے اور خریدنا چاہتا تھا۔

مکھنی حسین تھی اس لیے بک گئی۔ سرمایہ پرستوں کی دنیا میں ہر چیز منافع پر بکتی ہے۔ منافع اور مقابلہ، جو زیادہ دام دے وہ خرید لے۔ مکھنی کے باپ نے اُسے دو دھان کے کھیتوں کے عوض بیچ ڈالا۔ اس نے کیا بُرا کیا؟ اگر نمبردار ادھیڑ عمر کا تھا تو اس میں کیا حرج تھا؟ اگر یہ اس کی تیسری شادی تھی تو اُسے اس کی کیوں پروا ہو؟ دورِ حاضر میں سب سے زیادہ خوبصورت، قیمتی اور حسین چیز روپیہ ہے، اس لحاظ سے مکھنی خوش نصیب تھی کہ اُسے نہایت "خوبصورت اور حسین" خاوند ملا۔

اور آخر میں۔ جیسا دیوتاؤں نے کہا ہے، ایسا ہی ہونا تھا۔ قسمت کا لکھا اٹل ہے۔

غریب چھترپتی نے جب گاؤں پہنچ کر مکھنی کی شادی ہو جانے کی خبر سُنی، تو کیا اس کے دل پر آرے چل گئے؟ کیا اس کی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نکلا؟ کیا اس کے پتھر کے کلیجے سے ایک آہ نکلی؟ ہاں اتنی بات ضرور کہنی چاہیے کہ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور اس نے یہ خبر سن کر کسی سے بات تک نہ کی۔

تمام دن وہ ایک پتھر کی چٹان پر بیٹھا ہوا سیٹی بجاتا رہا۔ کئی نوجوان اُسے ڈھارس دینے کے لیے آئے لیکن پھر راستے ہی سے واپس مڑ گئے۔ ایک دو آدمیوں نے اسے کھانا کھانے کے لیے بھی کہا لیکن اس نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔ شام ہو گئی۔ پھر شفق کی سرخی رات کے اندھیرے میں مبدل ہو گئی۔ ایک دو کر کے آسمان پر ستارے بھی

نکل آئے تھے اور چاند بھی۔ لوگوں نے اسے اپنے گھر چلنے کو کہا لیکن اس نے پھر انکار کر دیا۔

اسی چٹان پر بیٹھے بیٹھے اس نے ساری رات بسر کر دی۔ وہ رات اس نے کیسے بسر کی، یہ کوئی نہیں جانتا۔ اس کی ناکام آرزوؤں کی تلخ کامیابیاں اسے کس محشرستان میں گھسیٹ کر لے گئیں؟ وہ کسی نئے جہنم کی آگ تھی جو اس کے سسکتے ہوئے دل سے اٹھی اور اس کے ہوش و حواس کو اپنے شعلوں کی لپیٹ میں لیتی ہوئی اس کی روح کو کچل گئی؟ وہ کیا قیامت تھی کہ برقِ ناگہاں کی طرح لپکتی ہوئی آئی اور آنِ واحد میں اس کے ظاہری و باطنی احساس کے ٹکڑے ٹکڑے کر گئی؟ یہ کس طرح ہوا؟ کیونکر ہوا؟ کیسے ہوا؟ اس راز کو کوئی نہیں جانتا۔ لیکن یہ بالکل سچ ہے کہ جب دوسرے دن صبح گاؤں والوں نے چھتر پتی کو اسی چٹان پر بیٹھا ہوا پایا تو اس کی آنکھوں کی بینائی ختم ہو چکی تھی اور اس کی طاقتِ گویائی ہمیشہ کے لیے اسے جواب دے گئی تھی۔

اس روح فرسا داستان کا اثر مجھ پر کئی دن رہا اور میں کتنے دن ہی اندھے چھتر پتی کو ڈھونڈتا رہا تاکہ اپنے قصور کے لیے معافی مانگ سکوں۔ لیکن اندھا چھتر پتی مجھے کہیں نہ ملا۔ چند دن اور گزر گئے اور میں نے سنا کہ اندھا چھتر پتی مر گیا۔ اس کی لاش شہر سے باہر دور ایک سڑک کے کنارے پائی گئی۔ کہتے ہیں اس کے گھٹنے کے زخم میں زہر پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے وہ تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

شام کے دھندلکے سے پہلے سیوا سمتی والوں نے اس کی لاش کو ایک میلی سی دھوتی میں لپیٹ کر نذرِ آتش کر دیا۔

مجھے کُتّے نے کاٹا

بات میں سے بات نکل آتی ہے، اس لیے ممکن ہے آپ پوچھ بیٹھیں کہ عنوان "مجھے کتے نے کاٹا!" کی بجائے "مجھے باؤلے کتے نے کاٹا" کیوں نہ سوچا۔ تو اس ضمن میں یہ عرض ہے کہ مجھے آج تک بھی، جب کہ اس حادثے کو گزرے ہوئے ایک مدت ہو چکی ہے، اس امر کا پتا نہیں کہ وہ کتا جس نے مجھے کاٹ کھایا تھا، باؤلا بھی تھا کہ نہیں۔ دراصل باؤلے اور غیر باؤلے کتے میں اتنا ہی فرق ہے جتنا کہ ایک پاگل اور ذی ہوش انسان میں، یعنی دونوں میں تمیز کرنا بہت مشکل ہے۔ یہ امر صرف نہایت دشوار ہی نہیں بلکہ بسا اوقات ناقابلِ حل نفسیاتی اُلجھنوں کا حامل بھی ہوتا ہے۔ خود میں اپنی زندگی کے کئی ایسے لمحے گن سکتا ہوں جب میں نے اپنے آپ کو بالکل پاگل متصور کیا ہے اور بارہا سڑک پر چلتے ہوئے میں نے اکثر شریف اجنبیوں کو مسکرا مسکرا کر اپنے آپ سے باتیں کرتے سنا ہے، یا چھڑی کو اس طرح زور زور سے گھماتے ہوئے اندھا دھند ہلاتے

ہوئے دیکھا ہے گویا کسی غیبی دشمن کے حملوں کا جواب دیا جا رہا ہے۔ اس وقت ان کے بشرے سے اتنی درشتی اور بربریت کا اظہار ہوتا ہے کہ چوک میں کھڑا ہوا پولیس کا سپاہی بھی مشتبہ نگاہوں سے دیکھ دیکھ کر دل میں سوچتا ہے کہ کہیں یہ وہی پاگل خانے سے بھاگا ہوا سودائی تو نہیں جس کا حلیہ میری ڈائری میں محفوظ ہے۔

چنانچہ جیسا کہ میں نے اوپر کہا ایک باؤلے اور ہوش مند کتّے کی پہچان کافی مشکل ہے، کم از کم عام انسانوں کے لیے۔ ایک ڈاکٹر بھی تو کافی دیر کے بعد فیصلہ کر سکتا ہے کہ کتّا پاگل تھا کہ نہیں اور اس دنیا میں ہر آدمی ڈاکٹر یا پاگل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب بازار میں چلتے چلتے کتّے نے مجھے کاٹ لیا، تو میں حیران سا رہ گیا اور پہلے چند لمحوں میں کچھ فیصلہ نہ کر سکا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ بات یوں ہوئی کہ وہ شام ذرا غیر معمولی طور پر خنک تھی اور شہر کے بازار میں بھی غیر معمولی رونق تھی۔ میں ایک بڑا بھدا کوٹ لپیٹے ہوئے بڑے مزے سے سگریٹ کے کش لگاتا ہوا جا رہا تھا کہ یکایک، جیسے قصّے کہانیوں میں اکثر ہوتا ہے کسی کتّے نے پیچھے سے آکر میری ٹانگ کو دبوچ لیا۔ ہاں خوب یاد آیا، وہ سیدھی ٹانگ تھی اور میں گرم پتلون پہنے ہوئے تھا۔ کتّے نے پہلے تو اپنے تیز تیز دانتوں سے پتلون کو پارہ پارہ کیا پھر بڑھ کر گوشت پر بھی، جیسا کہ قصّے کہانیوں میں اکثر لکھا جاتا ہے، محبت کی ایک مہر ثبت کر دی اور یہ سب کچھ اتنی پھرتی اور خاموشی سے ہوا کہ میں بھونچکا سا رہ گیا۔ دوسرے لمحے میں دیکھا تو کتا نظر سے غائب۔ یا مظہر العجائب!

اگلے چند ثانیے اسی بوکھلاہٹ میں گزر گئے۔ اس کے بعد خیال آیا کہ کتّے کا پیچھا کروں اور اسے پکڑ کر اور مار مار کر اس کا کچومر نکال دوں۔ ادھر دیکھا، ادھر دیکھا۔ شاید وہ اس موڑ کے پرے نرنجن داس کی دکان کے قریب سے گھوم گیا تھا، مگر کدھر؟ پھٹی پتلون

کے لٹکتے ہوئے ٹکڑوں کی طرف دیکھا اور اپنے درزی کے ہاں جانے کی صلاح نہیں کی۔ آخر بجلی کی سی سرعت کے ساتھ خیال آیا کہ اگر کتا پاگل ہُوا تو؟

نتیجہ یہ ہُوا کہ میں رام بھیجا مل انگریزی دوا فروش کی دکان پر پہنچا اور اس سے جلد جلد، چند ٹوٹے پھوٹے جملوں میں زخم پر دوا لگانے کو کہا۔ اس نے فوراً ایک تیز قسم کا کاربالک ایسڈ لگایا پھر زخم پر پٹی باندھ دی اور میرے منہ میں ایک سفید سفوف سا پھینک کر کہا:
"لو، اب دو گھونٹ گرم پانی کے پیو، کل بڑے ہسپتال چلے جانا اور ٹیکہ لگوانا، دیکھو ضرور۔"

میں دو دن متواتر غور کرتا رہا کہ بڑے ہسپتال جاکر ٹیکہ لگوانا مفید بھی ہو گا؟ چند دوستوں نے مشورہ دیا: "ارے میاں! جانے دو۔ اوّل تو آج کل سردیوں کے دنوں میں کتے سرے سے پاگل ہوتے ہی نہیں اور اگر کوئی خدانخواستہ پاگل ہُوا بھی تو اُسے بڑے بازار میں کون پھرنے دے گا؟ پھر ٹیکہ لگوانا تو ایک بہت بڑی زحمت ہے۔ کیا تم نے اس مہینہ بھر لکھا ہے؟ سارا پیٹ سوج جائے گا! ہمارے ہاں ساتھ کی کوٹھی میں ایک بوڑھے وکیل رہتے تھے، ان کے کتے نے ایک دن انہیں کھیلتے کھیلتے کاٹ کھایا تھا، بوڑھے وکیل صاحب نے پہلے تو کتے کو گولی کا نشانہ بنایا اور پھر خود ہسپتال میں ٹیکہ لگواتے پھرے۔ سارا پیٹ سوج گیا تھا۔ چھ مہینے بستر پر پڑے رہے آخر بوڑھے آدمی تھے، مر گئے۔"

بعض احباب نے کہا: "کیا واہیات ہے۔ ٹیکہ لگواتے پھرو گے، جانے دو میاں جانے دو۔ لال مرچیں اور سرمہ پیس کر زخم پر لگایا کرو، چند دنوں میں آپ ہی آپ زخم سے سارا زہر رِس رِس کر بہہ جائے گا۔ بھلا جب ہمارے ملک میں ٹیکے کا رواج نہ تھا تو کیا اس وقت اور کوئی شافی علاج نہ تھا، او ہو۔"

امجد نے کہا: "بھئی میں تو کھری کھری کہوں گا چاہیے کوئی ناراض ہی ہو جائے۔

اصل بات تو یہ ہے کہ یہ بہت ہی نامراد مرض ہے۔ جب اس مرض کی سب علامات ظاہر ہو جائیں تو پھر مریض کبھی نہیں بچتا۔ ارے اس کا کاٹا تو پانی بھی نہیں مانگتا۔ دراصل یہ ضرب المثل تو باؤلے کتوں پر صادق آتی ہے، نہ کہ بیچارے سانپوں پر۔ ہمارے محلے میں ایک نوجوان کو کتے نے کاٹ کھایا تھا، بیچارہ اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا، دس پندرہ روز یونہی ہلدی پیاز لگاتا رہا۔ پندرھویں روز اسے یکایک بخار اور ہذیان ہو گیا۔ خدا کی قسم بستر میں پڑا پڑا چھت تک اُچھل اُچھل جاتا۔ میرے اللہ! کتنا موذی مرض ہے۔ آدمی ہوا کا ایک جھونکا تک نہیں سہہ سکتا، سارا بدن کانپتا ہے اور پانی؟ پانی تو مطلق نہیں پی سکتا۔ دوسرے دن بیچارہ اس دنیا سے کوچ کر گیا۔" یہ کہہ کر امجد نے اپنی آنکھیں اوپر چڑھا لیں اور چھت کی طرف دیکھنے لگا۔

امجد کے اس بیان نے کہ "چھت تک اُچھل اُچھل کر جاتا تھا" مجھ پر بہت اثر کیا۔ میں نے تصور میں دیکھا کہ میں ہذیان میں پڑا ہوں اور چھت تک اچھل اچھل کر سر سے ٹکریں لگا رہا ہوں۔ گھر والے، احباب، دوست، بیوی، بچے سب رو رہے ہیں مگر میں کسی کے قابو میں نہیں آتا۔ اب منہ سے جھاگ جاری ہو گیا ہے، اب بھیجا بھی باہر نکل آیا ہے۔ میری بیوی سر پیٹ رہی ہے، بڑا لڑکا میرے پاؤں پکڑے ہوئے رو رہا ہے؛ لوگ میرے جنازے کو جا رہے ہیں؛ یہ میری قبر ہے، مرمریں لوح پر سیاہ حرفوں میں اُستاد ذوق کا شعر لکھا ہے:

سگِ دُنیا پس از مُردن بھی دامنگیرِ دنیا ہو
کہ اس کتے کی مٹی سے بھی کتا گھاس پیدا ہو

اتنے میں، امجد نے آنکھیں جھکا کر میری طرف دیکھا: "ہاں، میاں، ضرور، کل بڑے ہسپتال جا کر ٹیکہ لگوانا، کوئی ہنسی نہیں ہے، زندگی اور موت کا سوال ہے۔"

بڑے ہسپتال جاکر دیکھا تو حیران رہ گیا کہ مفلس و نادار کتوں کی جماعت کس طرح نوعِ انسان سے بدلے لے رہی ہے۔ کتے زیادہ باؤلے ہوتے ہیں جو اکثر بھوکے رہیں، جن کا مالک کوئی نہ ہو، جنہیں ہر جگہ سے دھتکارا جائے، گرمیوں میں کوئی پانی پینے کو نہ دے، سردیوں میں کسی مکان کے گرم گوشے میں پناہ نہ مل سکے، جسم پر خارش نکل آئے تو کہیں سے کوئی دوا دستیاب نہ ہو۔ اس حالت میں اگر دماغ چل جائے تو کیا عجب ہے۔ اگر وہ سوسائٹی سے بدلہ لینے پر تُل نہ جائیں تو اور کیا کریں؟ معاً میرے دل میں خیال آیا کہ چاہے وہ کتا پاگل ہو چکا ہے نہ ہو، اس میں تو کوئی کلام نہیں کہ مجھے کاٹ کر وہ غیر شعوری طور پر انسانی سوسائٹی کے خلاف، جس نے اس حیوان کو قابلِ رحم بنا دیا تھا، بڑی شدت سے احتجاج کر رہا تھا۔ غلامی میں ہمیشہ جیسا آپ ہی خوش رہتے ہیں، وہ اکثریت تو ہمیشہ بازاروں میں بھیک مانگتی دکھائی دیتی ہے۔ بیچارے کتے!

ایک بڑے کمرے میں پرچیاں لکھی جا رہی تھیں اور [illegible] لوگوں کی اتنی بھیڑ تھی کہ میں نے سمجھا کہیں بھول کر کسی الیکشن کیمپ میں گھس آیا ہوں، مگر [illegible] اطمینان ہو گیا جب میں نے [illegible] ایک صوتی آلہ دیکھا جس سے ڈاکٹر لوگ مریضوں کی چھاتی ٹھونکا کرتے ہیں۔ کرسی پر بیٹھ کر پرچی لکھائی۔ آپ کا نام، پتا، [illegible] انکم ٹیکس۔ یہ سب سوال اتنی جلدی سے کیے گئے کہ مجھے پھر شک ہو گیا، ہو نہ ہو یہاں ووٹروں کی پرچیاں بنائی جا رہی ہیں۔ جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا، ڈاکٹر صاحب نے فوراً پرچی ہاتھ میں دے کر کہا: "دوسرے کمرے میں ٹیکہ لگوا لیجیے، اُدھر سے جائیے، آداب عرض"

"آداب عرض"

دوسرے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ باہر برآمدے میں دو تین سو کے قریب آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ دروازہ پر دو تین لوگ کھڑے ہوئے تھے: غریب زمیندار میلی پگڑیاں اور تہمد باندھے ہوئے، کسی کی گود میں بچے، کسی کی بغل میں بقچہ، کسی کے کاندھے پر چھوٹا سا بستر، داڑھیاں بڑھی ہوئی، چہرے مسکین اور پژمردہ، ایسے چہرے جیسے کسی نے ٹھوکر مار مار کر مسخ کر دیئے ہوں۔ بوڑھی عورتیں روتے چلاتے ہوئے ننگے بچے۔ کوئی فرش پہ اکڑوں بیٹھا تھا، کوئی سامنے سبزہ کیاری میں لیٹا ہوا کراہ رہا تھا۔ مگر کچھ توقف کے بعد کھلتا۔ چپراسی پرچی پر سے نام پڑھ کر زور سے آواز دیتا جیسے عدالت میں پیشی ہوتی ہے، کوئی لاٹھی ٹیکتا ہوا جاٹ اندر داخل ہو جاتا اور پھر دروازہ کھٹ سے بند ہو جاتا۔ مجھے کسی نے بتایا: "آج آپ کی باری نہیں آئے گی اور اگر آئے گی بھی تو بہت دیر سے۔ اگر کل آپ صبح کو آئیں اور دوسرے دروازے سے، جو اس وارڈ کے دوسری طرف کھلتا ہے، اس طرف سے داخل ہوں، تو ۔۔۔۔ شاید سب سے پہلا نمبر آپ کا رہے گا۔"

دوسرے دن صبح ہی اٹھ کر گیا۔ ابھی ڈاکٹر صاحب تشریف نہ لائے تھے۔ کمرے میں ایک چپراسی الٹ پھیر رہا تھا، ایک کمپونڈر ٹیکے کی پچکاریوں کو سپرٹ سے صاف کر رہا تھا۔ چھوٹا ڈاکٹر یعنی ڈاکٹر کا نائب کانپتے ہوئے ہاتھوں سے رجسٹر پر کچھ درج کر رہا تھا۔

میں نے پوچھا: "ڈاکٹر صاحب ابھی نہیں آئے؟"

کمپونڈر نے جواب دیا: "وہ ادھر عورتوں کے کمرے میں ٹیکے لگا رہے ہیں۔"

کچھ توقف کے بعد کمپونڈر نے چھوٹے ڈاکٹر سے نہایت مسکین لہجے میں کہا: "جی آج میرے چھوٹے لڑکے کو بخار چڑھے ہوئے پندرھواں روز ہے۔"

"ہونہہ! پندرھواں روز!" ڈاکٹر نے قلم چھوڑ کر ٹہلتے ہوئے کہا: "کچھ مضائقہ نہیں

سنبھال لیں گے۔" یہ کہہ کر آپ آتش دان کے قریب ٹہلنے میں مشغول ہو گئے۔

چند لمحوں کے بعد آپ نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کمپونڈر کے چہرے پر گاڑ دیں اور اُس سے پوچھا: "اچھا تو اُسے بخار ہے، خوب، گویا کہ پندرھواں روز ہے؟ ہوں تو!"

اس کے بعد ایک تھوڑی خاموشی رہی۔ چپراسی گمرِیہ مسکین بنا ہوا آتش دان کے قریب آگ تاپتا رہا، کمپونڈر پچکاریاں صاف کرتا رہا، چھوٹا ڈاکٹر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر فرش پر ٹہلتا رہا۔ اس کے ہاتھ اس کی پتلون کی جیبوں میں تھے۔ آخر اس نے ہاتھ جیبوں سے نکال لیے اور دائیں ہاتھ کی چھنگلیا دوسرے ہاتھ کے انگوٹھے پر رکھ کر کہنے لگا "بخار ہے؟ پندرھواں روز ــــ کیا کھانسی بھی ہوتی ہے؟"

"جی نہیں" کمپونڈر نے سپرٹ لیمپ جلاتے ہوئے جواب دیا۔

ڈاکٹر کی بھویں تن گئیں گویا کہہ رہا تھا "کتنی بڑی بات ہے، بخار کے ساتھ کھانسی بھی نہیں۔"

ڈاکٹر بولا: "تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُسے نمونیا نہیں۔"

"جی، بالکل نہیں۔" کمپونڈر نے ٹیکوں کی ٹیوبیں گنتے ہوئے جواب دیا "ایک، دو، تین، چار، بالکل نہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ بڑے ڈاکٹر صاحب نے اُسے دیکھا تھا۔ کہنے لگے: 'اسے تپ محرقہ ہے، ڈیڑھ ماہ کے بعد بخار اترے گا' دوائی بھی نہیں دیتے ہیں۔ میں آپ سے گزارش کرنے والا تھا کہ . . ."

چھوٹے ڈاکٹر نے جلدی سے کہا "ٹھیک، ٹھیک۔ میں سمجھ گیا۔ آخر ہو سکتا ہے، بڑے بڑے ڈاکٹروں سے بھی تشخیص میں غلطی ہو جاتی ہے۔ میں خود اُسے چل کر دیکھ لوں گا۔"

کمپونڈر نے کہا: "آپ کی بہت نوازش ہو گی، مگر، مگر، میرا مطلب یہ تھا کہ گو بڑے

ڈاکٹر بہت مہربان ہیں، پھر بھی ——— بات یہ ہے کہ میں چاہتا تھا کہ آپ بڑے ڈاکٹر صاحب سے میرے متعلق سفارش کر دیں۔ میں تین چار روز کی چھٹی چاہتا ہوں۔ لڑکا سخت بیمار ہے، گھر پر بیچاری بیوی بھی گھبرائی ہوئی ہے اور ———"

"اوہ ———" ڈاکٹر نے رنجیدہ ہو کر "اوہ مگر، ہاں، ہاں، مگر بھئی، معاف کرنا، جب بڑے ڈاکٹر صاحب کو خود تمہارے لڑکے کی بیماری کا علم ہے تم خود انہیں سے چھٹی مانگ لو، اور نسخہ بھی تو انہیں کا ہے، میں کیسے سفارش کر سکتا ہوں!"

کمپونڈر نے سر جھکا لیا، ڈاکٹر ٹہلنے لگا۔

اتنے میں ایک دروازہ کھلا، اور بڑے ڈاکٹر صاحب داخل ہوئے۔ اُن کی مسکراہٹ ہی سے مترشح ہوتا تھا کہ یہی بڑے ڈاکٹر ہیں۔ اُن کے پیچھے پیچھے ایک نرس داخل ہوئی۔ میں نے ٹوپی اٹھا کر اس طرح سلام کیا کہ دونوں خوش ہو جائیں۔ دونوں خوش ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر کہا: "یہ پرچی ہے، مگر آپ کل نہیں آئے؟"

نرس نے کہا: "مگر زخم تو تھوڑا سا ہے ———"

"ہاں" ڈاکٹر صاحب نے کہا "زخم گو اتنا گہرا نہیں پھر بھی ٹیکے تو آپ کو پورے چودہ روز لگوانے پڑیں گے۔"

"صرف چودہ روز!" میں نے نرس کے سُرخ اور چمکیلے ہونٹوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

نرس مسکرا دی، بڑے ڈاکٹر ہنس کر چھوٹے ڈاکٹر سے باتیں کرنے میں مشغول ہو گئے۔

چھوٹا ڈاکٹر کہہ رہا تھا: "ہاں جناب میں ابھی ابھی کمپونڈر سے کہہ رہا تھا کہ بڑے ڈاکٹر صاحب کا نسخہ بہت ہی اعلیٰ ہے اور جناب تشخیص اسی عمدگی سے کرتے ہیں کہ مرض کو جڑ سے پکڑ لیتے ہیں۔ جی ہاں، بالکل ٹھیک۔ تپ محرقہ کے سوا اور کیا ہو گا، جی، بالکل ٹھیک، بجا فرمایا

آپ نے یہ چھٹی لے کر کیا کرے گا۔ یہاں آ گئے ہی کیا تھوڑا کام ہے۔ تین چار سو مریضوں کو روزانہ دیکھنا پڑتا ہے۔"

اتنے میں دروازہ پھر کھلا اور نیلی وردی پہنے ہوئے ایک چپراسی اندر داخل ہوا اور بڑے ڈاکٹر صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: "حضور کو بڑے ڈاکٹر صاحب یاد کرتے ہیں۔" جب بڑے ڈاکٹر چلے گئے تو میں سوچنے لگا: کتنی عجیب بات ہے۔ اس دورِ مہاجنی میں ہر کوئی دوسرے سے بڑا ہے۔ چھوٹا ڈاکٹر اور پھر اس سے بھی بڑا ڈاکٹر۔ کیا انسانوں کی غلامی کسی درجے پر پہنچ کر بھی ختم نہیں ہوتی۔ کتنی عجیب بات ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں۔

نرس بولی۔ (انگریزی میں) "تم بڑے شریر ہو۔"

میں نے کہا (انگریزی میں): "میں بالکل معصوم ہوں۔ مجھے باؤلے کتے نے کاٹ کھایا ہے۔ میں دکھ کا مارا ہوں۔"

نرس نے مٹک کر کہا: "میں ان معصوم شرارتوں کو خوب سمجھتی ہوں، اچھی طرح سے۔"

میں نے کہا: "تم بہت خوبصورت ہو، لو اب تو پیچھا چھوڑو۔ یہی بات تم میرے منہ سے کہلوانا چاہتی تھیں نا۔"

نرس: "بالکل جھوٹ، میں تمہاری چالوں کو خوب سمجھتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ میز کے قریب گئی اور پچکاریوں میں دوا بھرنے لگی۔

میں نے نرس سے پوچھا: "بھلا یہ تو بتاؤ اگر ایک دفعہ پورے ٹیکے لگوا لیے جائیں تو اگر پھر کوئی کتا کاٹ لے تو کیا اس صورت میں دوبارہ ٹیکے ـــ" میں نے فقرہ ناتمام چھوڑ دیا۔

نرس: تمہارا کیا ارادہ ہے؟ مجھے تم نیک آدمی معلوم ہوتے ہو، کیا تم سارے شہر

کے بارے کہو ں سے آپنے آپ کو کٹوا نے پر تیار ہو؟

میں: یہ میں نے کب کہا ہے ؟

نرس: تو پھر؟

میں: میرا مطلب یہ تھا کہ آخر تمہارا بھی کوئی کتا ہوگا۔

نرس: ہے۔ مگر وہ تمہاری طرح باؤلا نہیں۔

میں: (جھینپ کر) اس کا نام کیا ہے ؟

نرس: ٹیڈی

میں: کتنا بھونڈا سا نام ہے۔ تمہیں نام رکھنے کا سلیقہ تو ہونا چاہیے۔

نرس: شٹ اپ

پھر فوراً ہنس پڑی اور کہنے لگی: "اپنی پیچی دکھاؤ۔ کتنی دوائی بھری ہے۔ پانچ سی سی کہ سات؟"

بڑے ڈاکٹر صاحب اندر داخل ہوئے (اب انہیں منجھلے ڈاکٹر صاحب کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا) کہنے لگے: "آیئے آپ کو ٹیکہ لگا دیں" ایک چٹکی میں پسلیوں کے قریب پچکاری کی سوئی گھونپ دی اور کہنے لگے، "آپ کو تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

میں نے ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھا، نرس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور فوراً جواب دیا "مطلق نہیں ڈاکٹر صاحب!"

ڈاکٹر صاحب نے پیٹ سے سوئی نکالتے ہوئے کہا: "اور . . . میرا خیال ہے (کمپونڈر سے مخاطب ہو کر) تم نے پچکاری میں دوائی نہیں بھری، کیوں؟"

"جی" کمپونڈر نے ہچکچاتے ہوئے کہا "جی، مجھے ٹھیک طرح سے یاد نہیں،

شاید ــــــ"

نرس جلدی سے بولی "تو کوئی حرج نہیں۔ انہیں تکلیف تو مطلق ہوئی نہیں، دوسری پچکاری کر دیجیے۔"

ڈاکٹر نے کہا: "ہاں یہ درست ہے۔"

دوسرے انجکشن کے بعد میں نے ٹوپی اٹھائی اور کہا: "گڈ مارننگ ڈاکٹر صاحب!" (نرس کو) "گڈ ــــــ مارننگ۔"

ڈاکٹر صاحب: (موٹی اور تھکی ہوئی آواز میں) گڈ مارننگ۔

نرس: گڈ ما ــــ رننگ۔"

اُس کی آواز پتلی اور باریک تھی، جیسے دوائی پینے کے بلوریں گلاس کے ساتھ ایک نقرئی چمچہ ٹکرا جائے۔

کمرے سے نکل کر میں بڑے بڑے برآمدوں میں سے گزرتا ہوا ہسپتال کے اس عالیشان ایوان میں پہنچا جس کے اوپر نیلے کلسوں والے گنبد کھڑے ہیں اور چاروں دروازوں پر نیلی وردیوں والے خدمتگار ایستادہ ہیں۔ اسی ایوان کی خوبصورت، منقش چھت کے نیچے بوڑھا کسان اور اس کی بیوی چھوٹے ڈاکٹر کے آگے ہاتھ جوڑے ہوئے واپس جانے کا کرایہ مانگ رہے تھے۔

چھوٹے ڈاکٹر نے ترش رو ہو کر کہا: "کہہ ایک دفعہ جو کہہ دیا کہ تمہارے کاغذات کلکٹر صاحب کو بھیج دیے ہیں۔ تمہیں واپسی کا کرایہ مل جائے گا۔"

بوڑھے کسان نے آب دیدہ ہو کر کہا: "صاحب! ہم یہاں بالکل ناواقف ہیں، ہم

ہرگوئی سے آئے ہیں، یہاں ہمارا کون واقف ہے! ہرگوئی میں صاحب نے کہا تھا کہ واپس جانے کا کرایہ یہاں سے مل جائے گا۔ چودہ دن ہم میاں بیوی سرکار آپ کے سہارے ہی یہاں پڑے ٹیکے لگواتے رہے ہیں۔ اب واپس جانے کا کرایہ بھی آپ سے ہی مل جائے تو حضور کو دعائیں دیں گے۔"

ڈاکٹر نے جواب دیا: "مگر بھائی کرایہ اتنی جلدی تمہیں کہاں سے دے دیں؟ ہم نے تمہارے کاغذات کلکٹر صاحب کو بھیج دیے ہیں۔"

"سرکار!" کسان نے کہا، "ہم آج رات کو کہاں رہیں گے؟ روٹی کہاں سے کھائیں گے؟ ہرگوئی کے صاحب نے کہا تھا کہ یہاں سے واپس جانے کا کرایہ مل جائے گا اور ــــــ"

ڈاکٹر جلدی سے بولا: "پھر وہی، کرایہ، کرایہ، کرایہ۔ ایک دفعہ جو کہہ دیا۔" اتنا کہہ کر وہ چلنے لگا۔ مجھے دیکھ کر اس کی بشاشت عود کر آئی، ہنس کر کہنے لگا: "آپ نے ٹیکہ لگوا لیا، بہت اچھا کیا۔ اب آپ کل تشریف لائیں گے نا، اچھا، اچھا، گڈ مارننگ۔"

"گڈ مارننگ۔"

میں جب ایوان سے باہر نکلا تو کسان کی بیوی اپنی دہری کمر پہ ہاتھ رکھے پوپلے منہ سے ایک دروازے پہ کھڑی خدمتگار سے پوچھ رہی تھی: "کیوں بیٹا، کچہری کدھر ہے؟"

بات میں سے بات نکل آتی ہے، اُسی شام کو بڑے بازار کے چوک کے قریب میں نے ایک بڈھے آدمی اور بوڑھی عورت کو بھیک مانگتے دیکھا۔ میں اپنی دھن میں مست چلا جا رہا تھا کہ معاً کسی نے سامنے سے دو ہاتھ پھیلا دیے:

"بابا، پیسہ، ایک پیسہ۔"

دور پر شکن ہتھیلیاں کانپ رہی تھیں۔ میں نے نگاہ اٹھائی، یہ وہی بوڑھا کسان تھا جو لاٹھی ٹیکتا ہوا اپنی بیوی کو سہارا دیتا ہوا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ آہ، یہ دو غریب معصوم سی روحیں کیوں اس مکروفریب کی دنیا میں گھوم رہی تھیں! نکبت و یاس کے دو مٹتے ہوئے مرقعے تھے۔ ان کے لب بھیک مانگتے مانگتے سوکھ گئے تھے اور وہ اپنے کھیتوں سے بہت دور اس پردیس میں اکیلے تھے۔ بوڑھے کسان کی لرزتی ہوئی آواز میں نظر نہ آنے والے آنسوؤں کا نم تھا اور وہ غریب عورت کسی صدیوں کی مصیبت کے بوجھ سے جھکی جا رہی تھی۔

میرے دل پر چھریاں سی چل گئیں۔ یکایک میرے ذہن میں خیال آیا کہ غریبوں کو بھیک مانگنا اتنی آسانی سے کیوں آجاتا ہے۔ مجھے ایسا احساس ہوا کہ ان کی بدنصیبی کا میں خود ذمہ دار تھا۔ شاید یہ میرا ہی افلاس تھا جو اس طرح دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے مجھ سے بھیک مانگ رہا تھا۔

"بابا، پیسہ، خدا کا واسطہ، ایک پیسہ۔"

میں انہیں پیسہ دینے کی بھی ہمّت نہ کر سکا اور چپ چاپ ایک مجرم کی طرح سر جھکائے آگے بڑھ گیا۔

تالاب کی حسینہ

پہاڑی کے اوپر تالاب تھا۔ یہاں سے شہر کا منظر بہت دلفریب معلوم ہوتا۔ چھوٹا سا خوبصورت کوہستانی شہر، اس کے مکانوں کی ٹین کی چھتیں دھوپ میں چاندی کے تختوں کی طرح چمکتی ہوئی، شوالوں کے رنگین اور روپہلی کلس، سڑکیں، جن پر اودے رنگ کی بجری بچھی ہوئی تھی اور جن کے گرد دو رویہ شمشاد اور سرو کے درخت ایستادہ تھے، اس کے باغات جو آڑو، پلم اور خوبانیوں سے لدے ہوئے تھے۔ ان سب نے مل کر اس چھوٹی سی وادی کے حسن کو فزوں تر کر دیا تھا۔ شمال مغرب کے سلسلۂ کوہ پر ایک ہلکی، لطیف سی دھند چھائی ہوئی تھی۔ صنوبر، کائل اور دیودار کے گھنے درخت اس سپید دھند کی چادر میں لپٹے ہوئے تھے۔ پہاڑی کے قدموں میں یوکلپٹس کے درختوں کا ایک بڑا سا جھنڈ ایک لمبے سے کھیت پر سایہ کر رہا تھا۔ کھیت کے درمیان ہل میں جتے ہوئے دو بیل تھے اور اتنی بلندی پر سے دو خوبصورت کھلونوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔

میں نے ان دو بیلوں کی طرف دیکھتے ہوئے تالاب کے چوکیدار سے کہا: "فیروز بہت افسوس ہے، بہت ہی افسوس ہے، جب ہم نے یہ منحوس خبر سنی، جب، ہاں، پرسوں شام کو میں ڈاکٹر ساجد کے ہاں بیٹھا ہوا تھا کہ کسی نے مجھے بتایا کہ فیروز کا لڑکا تالاب میں ڈوب کر مر گیا۔ کیا بتاؤں یہ سُن کر کتنا رنج ہوا اسی وجہ سے ہم سب (اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کر کے) کل یہاں تیرنے کو نہیں آئے تھے۔ ایک دو بار جی میں آیا کر چلو چلیں، شاید ہماری چند رسمی باتوں سے تمہارے دل کو کچھ تسکین پہنچ سکے، مگر ہماری طبیعتیں ہی کچھ اس قدر افسردہ اور رنجور سی ہو گئی تھیں کہ اِدھر پاؤں ہی نہ اٹھ سکے۔"

فیروز نے چنار کی ایک ٹہنی کا سہارا لیتے ہوئے کہا: "ٹھیک کہتے ہو بابو جی۔ کل میں سوچتا تھا کہ بابو جی کیوں نہیں آئے۔ میں غریب تو ہوں مگر پھر بھی مجھے اُمید تھی کہ آپ ضرور افسوس ظاہر کرنے آئیں گے اور میری ڈھارس بندھائیں گے۔"

جگدیش بولا: "بس یہی بات تھی (میری طرف اشارہ کر کے) جو انہوں نے بیان کر دی۔"

دت نے کہا: "ہاں ہاں، بھلا نہ آنے کی اور کیا وجہ ہو سکتی تھی۔"

سرجیت نے پوچھا: "مگر یہ ہوا کیسے؟"

فیروز نے ایک آہ بھر کر کہا: "یہ کیونکر بتاؤں کہ یہ کیسے ہوا؟ کس طرح میرا ننھا منا لال آنکھوں دیکھتے دیکھتے ہمیشہ کے لیے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں ابھی تک اس امر کو سمجھ نہیں سکا کہ اُسے موت کیونکر آ گئی۔ بھلا یہ بھی کوئی موت ہے۔ اگر اُسے مرنا ہی تھا تو پہلے بیمار ہوتا، میں اُس کا علاج کرتا، اُسے ڈاکٹروں، حکیموں، عطائیوں، پنساریوں کے پاس اٹھائے اٹھائے پھرتا، اُن سے ہاتھ باندھ کر عرض کرتا خدارا میرے بچے کا اچھی طرح علاج کرو۔ ہم دونوں میاں بیوی بیماری کی راتیں جاگ جاگ کر کاٹتے۔ سارا دن اُس کے سرہانے بیٹھے

رہتے، اس کی ذرا ذرا سی فرمائش کو پورا کرنے کی کوشش کرتے۔ وہ کئی دنوں سے ربڑ کا کھلونا مانگ رہا تھا۔ ہائے میں نے اُسے کیوں منع کر دیا۔ میں نے اسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اگلی تنخواہ کے آنے پر تجھے لے دوں گا۔ کیا پتہ تھا کہ جب اگلی تنخواہ آئے گی میرا بیٹا کھلونا مانگنے کے لیے یہاں موجود نہ ہو گا۔ دل چاہتا ہے میں وہ ربڑ کا کھلونا، جو اُسے اس قدر پسند تھا، خرید لوں اور اپنے بیٹے کی قبر پہ جا کر رکھ دوں اور اس سے کہوں اٹھو، بیٹا منظور، تمہارا باپ تمہارے لیے ربڑ کا پیارا سا کھلونا لایا ہے۔ کیا وہ میری بات نہ سنے گا بابوجی؟

ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہم نے جلدی سے کپڑے اتارے اور غسل کا لباس پہننا شروع کر دیا۔

سرجیت بولا: "کے سال کا تھا منظور؟ یہی دو، ڈھائی، تین سال کا ہو گا، چھوٹا سا تو تھا ہی!"

فیروز بولا: "ہاں بابوجی، بس اتنی ہی عمر کا ہو گا، مگر کتنا پیارا بچہ تھا۔ آپ نے دیکھا تھا نا! سانولا رنگ، موٹے موٹے ہاتھ پاؤں۔ اُس کی ماں سعیدہ نے اُسے کتنی تکلیفوں سے پایا تھا، کتنے ہی پیروں، فقیروں سے گنڈے تعویذ لیے، منتیں مانیں، تب جا کر گھر کا لال ہاتھ آیا۔ یہ پتا نہ تھا کہ اتنی جلدی ہمیں جدائی کا داغ دے جائے گا۔ بس حیرت ہے تو یہی۔ ایمان سے کہتا ہوں، بابوجی، میرے کلیجے میں بس یہی ناسور ہے۔ وہ بیمار ہوتا میری آنکھوں کے سامنے کمزور ہوتا، میری آنکھوں کے سامنے اپنی ماں کی جھولی میں جان دیتا، پھر میں اسے کفناتا، دفناتا تو مجھے اتنا افسوس نہ ہوتا۔ مگر یہ کیا ہوا کہ میں یہاں (تالاب کے عین اوپر ایک مکان کی طرف اشارہ کر کے) اپنے مکان کے صحن میں کھڑا دور نیچے پگڈنڈی پر جاتے ہوئے ان خوش باش بے فکر نوجوانوں کی طرف دیکھ رہا تھا جو گاتے، ناچتے ہوئے بیساکھی کے

میلے پر جا رہے تھے، یہاں، تالاب میں، غربی سمت پر چند سکھ لڑکے نہا رہے تھے، اُدھر دوسری طرف چند عورتیں کپڑے دھو رہی تھیں، منظور کی ماں سعیدہ صحن میں چولہے پر مکی کی روٹیاں پکا رہی تھی، منظور اسی کے پاس کھڑا توتلی آواز میں کہہ رہا تھا "اماں آنی ہاماں اوتی" سعیدہ کی ماں کھاٹ پر بیٹھی چائے پی رہی تھی، پھر پتا نہیں کس وقت منظور اپنی ماں کے پاس سے اُٹھ کر چلا گیا۔ کپڑے دھوتی ہوئی عورتوں کی چھپا چھپ، نہاتے ہوئے سکھ لڑکوں کے قہقہے، بیساکھی کے میلے کو جاتے ہوئے جاتریوں کا شور و غل ۔ بس ہم نے ان چند منٹوں کے لیے منظور کو اپنے دل سے بھلا دیا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے تالاب کے کنارے سے کسی کو کہتے سُنا: "وہ لکڑی سی کیسی تیر رہی ہے۔" اس کے بعد "ارے" پھر "یہ تو کسی کی لاش ہے۔" پھر کسی نے کہا، "بچہ!" میں بھاگتا ہوا کنارے کی طرف گیا۔ کسی نے ہاتھ پاؤں چھوڑ کر کہا: "مر گیا" (چھاتی پر دو ہتڑ مار کر) ہائے!!

جگدیش: صبر کرو فیروز، صبر کرو!

فیروز: بابو جی صبر کروں تو کیسے؟ آنکھوں کے آگے اس کی بھولی بھالی صورت ہے۔ اب ہمارے پاس اس کی یاد کے سوا اور کیا رہ گیا ہے۔ (جیب میں ہاتھ ڈال دیتا ہے) اور بابا (جیب سے ہاتھ نکال کر) یہ پتلی سی مسواک۔ یہ مسواک اور ایک چھوٹی سی مٹی کی پیالی میں نے یہ دونوں چیزیں اس چھوٹی سی نہر کے کنارے پائیں جو اس تالاب کو پانی مہیا کرتی ہے۔ وہ صحن سے اتر کر نہر کی ان سیڑھیوں کی طرف آیا ہوگا۔ آہستہ آہستہ اس نے جھک کر مٹی کی پیالی میں بھرا ہوگا، مسواک کو زمین پر رکھ کر اس نے نہر میں ہاتھ ڈال کر پانی سے کلی کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ پھر وہ یکایک پھسل گیا ہوگا۔ پانی میں ہلکا سا شور بھی پیدا ہوا ہوگا۔ اس نے چیخنے کی کوشش بھی کی ہوگی۔ تالاب کے کنارے تک جاتے جاتے اس نے ہاتھ

پاؤں بھی مارے ہوں گے۔ مگر آہ، میری آنکھوں نے کچھ نہ دیکھا، نہ کانوں نے سنا، سوا ان گھنٹوں کے جو راہگیر گا رہے تھے۔ سعیدہ روتی بلکتی رہی، بڑی اماں کھاٹ پر چلاتی پیٹتی رہیں۔ اور سامنے نہر کے کنارے ہماری آنکھوں کے سامنے . . . ہائے . . . ہائے، بابوجی، صبر کیسے آئے؟

امرجیت: یہ مشیتِ ایزدی تھی، اس میں کسی کا کیا دخل۔ خدا نے تمہیں دیا، اسی نے لے لیا۔ تمہارا اس پر اتنا ہی حق تھا۔

فیروز: سچ ہے بابوجی، انسان کیا کر سکتا ہے؟

دت: کیسا پیارا بچہ تھا۔ جگدیش، تمہیں یاد ہے وہ دن، وہ اس نہر کے کنارے اپنی چھوٹی سی قمیص دھو رہا تھا؛ کتنا پیارا معلوم ہوتا تھا۔ یاد ہے، میں نے تم سے کہا تھا، اس وقت کیمرہ ہوتا تو اس کی تصویر کھینچ لیتے اور انعامی مقابلے کے لیے بھیجتے۔

سعیدہ، جو اب تک پاس کھڑی چپ چاپ سب باتیں سن رہی تھی اور آنچل سے آنسو پونچھتی جاتی تھی، بھرائی ہوئی آواز میں بولی: "بابوجی، کنور لوک ناتھ سنگھ جی، جو ڈاک بنگلے کے قریب ایک کوٹھی میں رہتے ہیں، انہوں نے ایک بار منظور کی تصویر کھینچی تھی۔ ہم نے کئی بار اُن سے وہ تصویر مانگی ہے مگر وہ دیتے نہیں۔ اگر آپ اُن سے کہیں تو —"

جگدیش بولا: بہت اچھا سعیدہ، میں ضرور ان سے کہوں گا، اُمید ہے وہ تصویر دے دیں گے۔

اب ہم سب غسل کا لباس پہن کر تالاب کے کنارے پر پہنچ چکے تھے۔ تالاب کی وسیع چادرِ آب ہمارے سامنے تھی جس پر کہیں کہیں نیلوفر کے پھول کھلے ہوئے تھے۔

میں ہاتھ چھپا کر، ایڑیاں اٹھا کر غوطہ زنی ہونے کو تھا کہ سرجیت نے آہستہ سے کان میں انگریزی زبان میں کہا: "پیچھے دیکھو!"

میں نے مڑ کر دیکھا، چنار کے درخت کے قریب، جنگلی گلاب کی بیلوں کے درمیان ایک لڑکی کھڑی تھی۔ سرو کی طرح خوش قامت اور جنگلی گلاب کے پھول کی طرح خوبصورت اور نازک اندام۔ اُس کی دونوں کلائیاں اُوپر اُٹھی ہوئی تھیں اور سر پر رکھی ہوئی مٹی کی گاگر کو تھامے ہوئے تھیں۔ سعیدہ اُس کے پاس کھڑی اشاروں میں اُسے کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ کتنی نازک، کتنی خوبصورت تھی۔ بانکے، ترچھے، دلآویز نقش۔ کیا ایک عورت بھی اس قدر حسین ہو سکتی ہے! مجھے احساس ہوا یہ عورت نہیں چغتائی کی ایک تصویر ہے۔

میں نے سرجیت سے پوچھا: "یہ کون ہے؟"

سرجیت نے استعجاب ظاہر کرتے ہوئے کہا: "تم نہیں جانتے یہ کون ہے؟ حیرت ہے! یہ ایک کماری ہے اور پرے تالاب کے اُس پار (انگلی سے اشارہ کر کے) وہ جو گھر ہے نا کچا سا، وہاں رہتی ہے۔ سب جج صاحب کا لڑکا، جو یہاں نہانے کے لیے آیا کرتا ہے، اس نے اس کا نام "تالاب کی حسینہ" رکھ دیا ہے۔"

"تالاب کی حسینہ ... تالاب کی حسینہ ..." میں نے دہراتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو سعیدہ اسے کیسے اشارے کر رہی ہے؟"

"بیچاری غریب لڑکی گونگی ہے نا۔"

"اوہ" میں نے آہستہ سے کہا۔ یکایک میرے دل میں خیال آیا یہ لڑکی گونگی ہے، یہ تو بہت ہی اچھا ہے۔ کیا کسی نے چغتائی کی تصویر کو بولتے دیکھا ہے؟ اگر تصویر خاموش تصویر بول اُٹھے تو اس کی آدھی شعریت، رنگینی اور سحر پروری فنا ہو جائے۔ کاش دنیا

کی تمام حسین عورتیں گونگی ہوتیں۔"

ہم سب کی نظریں اپنی طرف گڑی دیکھ کر وہ لڑکی حیران سی ہو گئی۔ اُس نے اپنی بڑی بڑی وحشی ہرنیوں والی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھا، وہ گھبرا کر ٹھٹک سی گئی، اُس نے اپنا رُخ ہماری طرف سے پھیر لیا۔ کانوں میں پڑے ہوئے موتیے کے آویزے یکایک سورج کی کرنوں میں چمک اُٹھے۔ اس نے سعیدہ کی طرف دیکھ کر سر کو ایک خفیف سی جنبش دی۔ مٹی کی گاگر میں ایک خفیف سا ارتعاش پیدا ہوا، پاؤں کی جھانجنیں بجنے لگیں، ساکن تصویر میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ آہستہ آہستہ پگڈنڈی پر سے نیچے اترنے لگی۔

میں نے یکایک کہا: "تم جانتے ہو سرجیت ہندوستانی رقص کی ایجاد کیسے ہوئی؟"

"نہیں، کیوں؟"

میں نے پگڈنڈی پر سے نیچے اترتی ہوئی لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا: "وہ دیکھو، ایک مٹی کی گاگر اٹھائے ہوئے دوشیزہ اور ٹخنوں پر بجتی ہوئی روپہلی جھانجنیں، یہی ہندوستانی رقص کی ابتدا اور انتہا ہے!"

جگدیش نے ہنستے ہوئے کہا: "میرا خیال ہے تم اس غریب لڑکی کو نگاہوں سے نگل جاؤ گے، کیسی گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہے ہو۔ اب نہاتے بھی ہو کہ دوں میں تمہیں پانی میں ایک غوطہ۔"

اتنا کہہ کر جگدیش نے شانے پھیلا کر، ایڑیاں اٹھا کر، ہوا میں ابابیل کی طرح ایک زقند بھری اور دوسرے لمحے میں وہ پانی میں دھم سے غوطہ زن ہو گیا۔

اس کے بعد دھم، دھم، دھم ہم سب پانی میں کود پڑے اور فضا بلند قہقہوں سے معمور ہو گئی۔ سطحِ آب پر بازوؤں کے تیز تیز چپو چل رہے تھے، ایک دوسرے پر

پانی اُچھالا جا رہا تھا۔ نیلوفر کے پھول توڑ توڑ کر ایک دوسرے کی طرف پھینکے جا رہے تھے؛ دت بار بار منہ میں پانی بھر کر زور سے کلیاں کرتا تھا، سرجیت کو تیرنا کم آتا تھا اس لیے وہ سب سے الگ تھلگ آہستہ آہستہ ہاتھ پاؤں مار کر تیرنے کی مشق بہم پہنچا رہا تھا۔ جگدیش اس کے قریب گیا اور اس کے سر کو اپنے بازوؤں میں تھام کر پیار سے بولا: "ایں دفتر بے معنی (ایک ڈبکی لے کر) غرقِ مئے آب اولیٰ" سرجیت چلّانے لگا کنارے پر فیروز کھڑا افسردہ نگاہوں سے تالاب کے پانی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

فیروز کی اداس نگاہیں میرے دل میں ایک عجیب خلش پیدا کر رہی تھیں۔ تیرتے تیرتے میں نے سوچا کہ اس زندگی کے بے پایاں تالاب میں ہمیشہ یہی ہوتا رہے گا، یہاں ہنسی کی لہریں ہیں اور موت کے چھینٹے بھی، اور پھر کبھی کبھی کوئی خوبصورت کہاری...

آنگی

مسافر نے آسمان کی طرف نگاہ اُٹھائی۔ آسمان کے گہرے نیلے سمندر میں بادلوں کے سفید سفید ٹکڑے برف کے بڑے بڑے تودوں کی طرح تیر رہے تھے اور ان کے قریب چیلیں منڈلا رہی تھیں۔ چیلیں؟ اس نے ہانپ کر اپنے ماتھے پر سے پسینہ پونچھا۔ اب کوئی گاؤں قریب ہی ہوگا۔ چیلیں انسانی آبادی کا نشان ہیں۔ اس نے دل میں سوچا۔ گدھ، کوّے، چیلیں، انسان۔۔۔ ان جانوروں کی صفات ایک دوسرے سے بہت ملتی جلتی ہیں۔ اسی طرح سوچتا ہُوا، عالمِ حیوانات کی خصوصیات کے متعلق مختلف نظریے قائم کرتا ہُوا وہ بہت سارا راستہ طے کر گیا۔ کئی جگہ ترچھی ڈھلانیں تھیں، کئی جگہ اُونچی گھاٹیاں تھیں جن کے دامن میں کھڑے ہوئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی چوٹیوں پر بادلوں کے محل بنے ہیں۔ مگر جب وہ گھاٹی کی چوٹی پر پہنچتا تو بادلوں کا محل یکایک اوپر اُٹھ کر آسمان میں معلق ہو جاتا۔ اس دنیا میں کتنا دھوکا ہے۔ مسافر کے تخیل نے اب دوسری پگڈنڈی اختیار

کی۔ مہاتما بدھ نے ٹھیک کہا تھا: قدرت ایک سراب ہے۔ اس نے پھر نگاہ اٹھا کر دور آسمان میں تیرتے ہوئے بادلوں کو دیکھا۔ سپید، براق، چمکتے ہوئے لاکھوں تاج محل تھے اور چاروں طرف جمنا کا نیلا پانی پھیلا ہوا تھا۔ اس نے سوچا: ان مرمریں محلوں کو کس شاہجہاں نے بنایا ہے؟ اور کس محبوب کی یاد میں؟

مسافر اسی طرح اپنے دل سے باتیں کرتا ہوا بہت دور نکل گیا۔ اب ہواؤں میں خنکی سی آگئی تھی اور سورج مغرب کی طرف جا رہا تھا۔ سامنے پہاڑوں پر صنوبروں کے خاموش جنگل کھڑے تھے جن کا گہرا سبز رنگ ڈوبتے ہوئے سورج کی شعاعوں میں ہلکا ارغوانی سا ہو رہا تھا۔ یہ رنگ آخر ہے کیا؟ نیلا، پیلا، سبز، ارغوانی اور پھر ایک ہی قوس قزح میں ساتوں رنگ۔ یا شبنم کے ایک ہی قطرے میں پوری قوس قزح۔ عجیب بات ہے! یہ کیسی دنیا ہے؟ میں کہاں جا رہا ہوں اور وہ گاڑی ابھی تک کیوں نہیں آیا۔

وہ کاندھے پر پڑے ہوئے جھولے کو درست کر کے اپنی چھتری کو زمین پر ٹیک کر راستے میں کھڑا ہو گیا اور سرسری نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ خاموشی، گہری خاموشی اور پھر یکایک گھنٹیوں کی پُرشور صدا۔ اُسے یوں معلوم ہوا کہ لاکھوں مندر اور کلیساؤں کے گھنٹے ایک دم جھنجھنا اُٹھے ہیں۔ مسافر کا خیر مقدم کرنے کے لیے اُن کی آواز نے وادی کے خاموش طلسم کو توڑ دیا۔ یہ آواز بڑھ کر فضا میں پھیل گئی، اوپر اٹھتے ہوئے بادلوں سے ٹکراتی ہوئی معلوم ہوئی اور پھر گھوم گھوم کر مغرب کی سمت آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ مغربی موڑ سے بھیڑوں، بکریوں، گایوں، بھینسوں، بیلوں کا ایک ریوڑ نکل رہا تھا۔ مسافر راستہ چھوڑ کر ایک طرف اونچے سے ٹیلے پر کھڑا ہو گیا۔

"ہا ہش ہی۔ ہا ہا ہش ہا ہا نیلتی۔ ہا ہا تی ہی ہی۔"

نیلتی اور باقی دو خوبصورت بچھڑیاں واپس گھر جانے کی خوشی میں ہرن کی طرح قلانچیں بھر رہی تھیں اور بیچاری چرواہی کو انہیں ریوڑ کے ساتھ رکھنے میں دقت محسوس ہو رہی تھی۔ نیلتی کبھی بھیڑوں کے گلے میں گھس جاتی اور انہیں اتنا پریشان کرتی کہ وہ "بے با، بابے" کرتی ہوئی تتر بتر ہو جاتیں اور سارے ریوڑ کے نظام کو، جو کسی تربیت یافتہ فوج کی باقاعدگی کے ساتھ چل رہا تھا، توڑ دیتیں۔ بلی ناچتی کودتی ہوئی بکریوں کے قریب جاتی اور انہیں دھکے مار مار کر آس پاس کے ٹیلوں پر چڑھا دیتی۔ بڑی بوڑھی گائیں اور بھینسیں نہایت اطمینان سے اور قدرے حقارت سے یہ منظر دیکھتی جاتی تھیں، گویا کہہ رہی تھیں: "کر لے دو دن عیش، پھر وہ دن بھی آئے گا جب تیری پچھلی لاتوں کو باندھ کر تیرا دودھ دوہا جائے گا۔ اُس وقت اُچھلنا۔ پھر تیری چال بھی ہماری طرح بے ڈھنگی ہو کر رہ جائے گی۔ اب جی بھر کر مست ہرنی کی طرح قلانچیں بھر لے۔"

نیلتی اُچھلتی ہوئی مسافر کے قریب آ گئی۔ اُس کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی خوش آئند آواز اُس کے ناچتے ہوئے قدموں کے لیے گھنگروؤں کا کام دے رہی تھی۔ پھر اپنے اگلے پاؤں ٹیلے پر ٹیک کر وہ مسافر کے پاؤں سونگھنے لگی، جیسے جنگل میں گھاس کے کسی خوشے کو سونگھ رہی ہو۔ "نیلتی، ہا!" چرواہی نے اپنی پتلی آواز میں چلا کر کہا۔ اُس کی آواز بھی ایک گھنٹی سے مشابہ تھی مگر حسین نیلتی نے کوئی پروا نہ کی۔ شاید شوخی سے یا شرارت سے بیچاری چرواہی کو تنگ کرنے کے لیے وہ مسافر کا بوٹ چاٹنے لگی۔

"نیلتی ہاہا، ہش، نیلتی ہی!" وہ پھر چلائی۔

چرواہی مسافر کے بالکل قریب آ گئی اور سونٹے سے نیلتی کو سزا دینے لگی۔ بیچاری تنگ آ گئی تھی۔ چہرے پر پسینے کے قطرے تھے اور گال بھی غصے سے تمتمائے ہوئے

تھے۔ نیلیتی کو پرے ہٹا کر اس نے نڈر نگاہوں سے مسافر کی طرف تاکا: "راہی کوکو؟"
(راہی - ماہرو - کدھر جا رہے ہو؟) اُس نے پہاڑی زبان میں مسافر سے پوچھا۔

مسافر مُسکرا دیا، پھر کہنے لگا: "یہ نیلیتی کتنی شریر ہے؟"

چرواہی کے چہرے سے ترشی جاتی رہی۔ وہ نیلیتی کی طرف، جو کمبخت مار کھا کر بھی ناچتی بھاگتی ہوئی جا رہی تھی، پیار کی نگاہوں سے دیکھ کر بولی: "ہاں، ابھی تین سال بھی اس کی عمر نہیں۔"

"ہم ــــ اور تمہاری عمر کتنی ہے؟"

چرواہی نے ایک لمحے کے لیے مسافر کی طرف حیران نگاہوں سے دیکھا، دوسرے لمحے میں اس کا چہرہ شرم سے لال ہو گیا۔ اس نے منہ پھیر لیا اور ریوڑ کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ وہ گایوں کی پیٹھ پر ہلکے ہلکے سونٹے مار رہی تھی۔

مسافر ٹیلے سے اتر کر چرواہی کے ساتھ ہو لیا اور اس کا سونٹا چھین کر کہنے لگا: "معلوم ہوتا ہے آج تمہارا بڑا بھائی تمہارے ساتھ نہیں آیا، جبھی تو ریوڑ چرانے میں تمہیں اتنی تکلیف ہوتی ہے۔ اب دیکھو، میں ریوڑ سنبھالتا ہوں اور تم ایک شریف ننھی لڑکی کی طرح میرے پیچھے چلی آؤ۔ میں تھکا ہوا ہوں، مجھے بہت دور جانا ہے۔ سورج غروب ہونے کو ہے۔ کتنی دُور ہے تمہارا گاؤں! یہ ہم واپس کدھر جا رہے ہیں؟"

چرواہی نے ہنستے ہوئے کہا: "گاؤں تو تم پیچھے چھوڑ آئے تھے اسی لیے واپس جا رہے ہو۔ وہ دیکھو نا، اس گھاٹی کے قریب (انگلی اٹھا کر) وہ رہا ہمارا گاؤں۔"

"کیا نام ہے؟"

چرواہی نے جلدی سے جواب دیا: "سارو۔"

مسافر نے چرواہی کی طرف دیکھ کر کہا: "میں کہنے کو تھا۔ تمہارا نام کیا ہے؟"
"میرا ـــ میرا نام آنگی ہے،" (آنگی نے رکتے رکتے جواب دیا)۔ "تم کہاں سے آ رہے ہو؟"

مسافر نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں، زور زور سے ریوڑ کو آوازیں دینے میں مصروف ہو گیا۔

"ہش ہا ہا، نیلتی ہا، آنگی ہا ہا، بلی آ ہا۔"

آنگی ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی: "اچھا تو گویا میں بھی ایک بچھیا ہوں۔ اوہو ہو۔ میں ہنستے ہنستے مر جاؤں گی۔ یہ راہی کتنا عجیب ہے۔ ہا ہا۔ تم تو ریوڑ کو بھی قابو میں نہیں رکھ سکتے، اِدھر لاؤ سونٹا!"

اور چرواہی نے ہنستے ہنستے مسافر سے سونٹا چھین لیا۔

مسافر کو سارد گاؤں بہت پسند آیا۔ بس کوئی بیس پچیس کچے گھر تھے، اسپید مٹی (کھریا) سے پُتے ہوئے، ناشپاتیوں، کیلوں اور سیبوں کے درختوں سے گھرے ہوئے۔ سیب کے درختوں میں پھول آئے ہوئے تھے، کچی، سبز، چھوٹی ناشپاتیاں لٹک رہی تھیں اور کھیت مکی کے پودوں سے ہری مخمل بنے ہوئے تھے۔ کیلوں کے ایک بڑے جھنڈ کی آغوش میں گنگناتا ہوا نیلا جھرنا تھا اور اُس سے پرے ایک چھوٹا سا میدان تھا جس کے وسط میں شتو کا قد آور درخت اپنی شاخیں پھیلائے ہوئے کھڑا تھا۔ اُس کا سایہ اتنا لمبا ہو گیا تھا کہ پرے اور نیچے بہتی ہوئی ندی کے کنارے تک پہنچ رہا تھا۔ ندی چھوٹی سی، کسی نازک پتلی سی ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی شمال مشرق کے برفیلے پہاڑوں سے آرہی تھی اور ڈوبتے ہوئے آفتاب کے پیچھے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ نظر کے آخری

نقطے پر وہ دو پہاڑیوں کے پتلے کناروں سے گزرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی جہاں اب سورج چمک رہا تھا۔ اس کے پرے مسافر کا دیس تھا۔ وہ وہاں کب واپس جائے گا؟ کیا وہ کبھی واپس جا سکے گا؟ یہاں کتنا سکون ہے! آرام، زندگی، موت۔ تینوں نے مل کر یہ خوشنما دادی سی بنا ڈالی ہے۔ یکایک اُس کی آنکھوں کے آگے ریل گاڑی کے گھومتے ہوئے پہیے اچھلنے لگے۔ یہ کیسا شور ہے! یہ انسان موت سے بھی بڑھ کر "خاموشی" سے کیوں اتنا ڈرتے ہیں؟ ہر وقت شور مچاتے ہیں، گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتے ہیں، کس لیے؟ یہاں کتنا سکوت ہے، حسن، راحت۔ نیچے پگڈنڈی پر، ندی کے کنارے سے، آنگی کسی بے فکر ہرنی کی طرح قدم رکھتی ہوئی آ رہی تھی۔ کاندھے پر پتلی سی سونٹی تھی، لبوں پر ایک بے معنی سا گیت۔ پاؤں ننگے تھے لیکن چال پہ ایک خاموش موسیقیت کا شبہ ہوتا تھا۔ مسافر نے اپنی کتاب بند کر دی اور آنگی کی طرف دیکھتے ہوئے سوچنے لگا: کاش وہ مصور ہوتا! کتنی خوبصورت تصویر ہے، کتنا دلکش پس منظر۔ آنگی کے ہلتے ہوئے سڈول مگر مضبوط بازو، اُس کی کمر کا متناسب خم۔ اچھا تو وہ سنگتراش ہی ہوتا۔ دنیا میں کسی کی آرزوئیں پوری نہیں ہوتیں۔ ورنہ وہ ایک ایسا مجسمہ تیار کرتا کہ یونانی صنم۔ گر بھی ششدر رہ جاتے۔ اتنے میں آنگی نے اُسے دیکھ لیا۔ عجیب بات ہے، وہ کیوں ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی ہے؟ اس کے لبوں پر بے معنی گیت کیوں رُک گیا ہے؟ وہ سونٹی سے زمین پر کیا لکھ رہی ہے۔ آں پڑھ آنگی!

مسافر نے زور سے آواز دی: "آنگی!"

آنگی نے ضرور سن لیا ہے مگر اس نے جواب کیوں نہیں دیا؟ وہ اب اوپر چڑھ رہی ہے، گھاٹی کے پیچ در پیچ راستے پر سے گزرتی ہوئی ادھر آ رہی ہے۔ مگر اب اس کی چال مختلف

ہے۔ بازو اب بے پروائی سے نہیں ہل رہے اور گردن ایک طرف کو جھک گئی ہے۔ یہ اب ایک نئی تصویر ہے ایک نیا مجسمہ ہے۔ وہ جنگل کی دیوی تھی تو یہ دوشیزۂ سحر ہے۔ اس مجسمے کی تلاش نرالی ہے، اس تصویر کا رنگ نیا ہے، اس گیت کی لے انوکھی ہے۔ کاش وہ مغنی ہی ہوتا!

آنگی گھاٹی پر چڑھ آئی۔ وہ مسافر کے قریب بیٹھ گئی اور سونٹی کو سبز دوب پر رکھ کر سستانے لگی۔ مسافر غور سے اُس زلف کی طرف دیکھنے لگا جو آنگی کے رُخ پر آتی تھی یکایک آنگی بول اٹھی "تم واپس کب جاؤ گے راہی! جب تم اپنا نام بھی نہیں بتاتے تو پھر میں تمہیں راہی ہی کہوں گی، ٹھیک ہے نا؟"

مسافر نے کتاب کے ورق الٹتے ہوئے کہا: "ٹھیک ہے۔ اور راہی پھر کوئی اتنا برا نام بھی نہیں۔ بات اصل میں یہ ہے آنگی کہ میں یہاں اپنی صحت کو بہتر بنانے آیا ہوں جب اچھا ہو جاؤں گا چلا جاؤں گا۔"

آنگی نے نہایت اشتیاق سے پوچھا: "کدھر جاؤ گے؟"

مسافر نے نہایت بے پروائی سے داہنا بازو اٹھا کر کہا: "اِدھر جاؤں گا۔"

"تم کہاں سے آئے ہو؟"

اس دفعہ مسافر نے دوسرا بازو پھیلا کر کہا: "اُدھر سے آیا ہوں۔"

آنگی کی آنکھیں غیر معمولی طور پر روشن ہو گئیں، رُکتے رُکتے کہنے لگی: "راہی تم کتنے عجیب ہو!"

اور راہی دل میں سوچنے لگا: "کیا واقعی میں عجیب ہوں، کیا یہ منظر عجیب نہیں۔ یہ خواب کی سی خاموشی، یہ موت کی سی زندگی، یہ آنگی کے رُخ پر بل کھاتی ہوئی زلف، کیا یہ

سب عجیب نہیں! آنگی کا کرتہ جگہ جگہ سے پھٹا ہُوا ہے اور اُس میں درجنوں پیوند لگے ہیں مگر وہ کس شان سے گردن اونچی کیے ندی کی طرف دیکھ رہی ہے جس کے پانیوں کا رنگ اس کی آنکھوں کی طرح ہی نیلا ہے۔ کیا یہ عجیب بات نہیں۔ آنگی کے ہاتھ کتنے مضبوط نظر آتے ہیں۔ لمبی مخروطی، مضبوط انگلیاں جو ہل کی ہتھی پر زور سے جم جاتی ہوں گی۔ ان کلائیوں نے غالباً کبھی چوڑیوں کی کھنک نہیں سنی، کس قدر عجیب بات ہے۔ مگر خود میرے ہاتھوں میں نسائیت کی جھلک نمایاں ہے اور ایک چاقو سے اپنا قلم درست کرنے میں مجھے اتنا وقت صرف کرنا پڑتا ہے جتنا آنگی کو آدھے کھیت میں ہل چلانے کے لیے۔

کئی دنوں کے وقفے کے بعد مسافر کی آنگی سے ملاقات ہوئی تو اُس نے کہا:

"آنگی تمہیں اتنے دنوں سے نہیں دیکھا۔"

آنگی نے جواب دیا: "عجیب بات ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ تم اتنے دن کہیں غائب رہے۔ اب بہت دن ہوئے تم نے وہ اپنی تاروں والی بنسری (وائلن) نہیں سنائی۔ ابھی پرسوں ہی کی بات ہے ہم سب منّو کے نیچے بیٹھے، ہائے فیروزہ سے الغوزہ سن رہے تھے۔ تمہیں پتا ہے نا؟ وہ الغوزہ بہت ہی اچھا بجاتا ہے۔ کرن کہنے لگی، پتا نہیں، کیوں آج کل وہی دکھائی نہیں دیتا۔ اُس سے اُس کی تاروں والی بنسری بجانے کو کہتے، کیوں؟"
اتنا کہہ کر آنگی نے مسافر کی طرف دیکھا۔

مسافر کی انگلیاں بے چین ہو گئیں۔ اس نے اپنا ہاتھ آنگی کے ہاتھ کے اتنا قریب رکھ دیا کہ ایک کی انگلیاں دوسرے کو چھو رہی تھیں۔ آہستہ سے بولا: "ہاں درست ہے۔ میں آج کل لمبی لمبی سیریں کرنے کے لیے گاؤں سے بہت دور نکل جاتا ہوں۔ کبھی کبھی ان صنوبروں

کہ گھنے جنگلوں میں چلا جاتا ہوں۔"

"تمہارا کیسے جی لگتا ہے؟"

"اکیلا تو نہیں ہوتا۔ کبھی کوئی کتاب لے جاتا ہوں، کبھی کچھ لکھتا ہوں، کبھی اپنی تاروں والی بانسری بجاتا ہوں۔"

آنگی نے بیرونی سے مسافر کی حیرت دیکھا: "تم بھی تم کتنے عجیب ہو!"

اس کی سانس میں شہد کی سی مٹھاس تھی۔

برسات کے آخری دنوں میں مکی کی فصل پک گئی۔ سارو گاؤں والوں نے منو کے درخت کے آس پاس بڑے بڑے کھلیان لگائے۔ مکی کے کھلیان اور پیلی پیلی گھاس کے ذخیرے۔ منو کے قریب ہی تین چار جگہ وہاں پر پتلی سی چھوٹی خود رو گھاس کو چھیل کر گول گول قطعے تیار کیے۔ انہیں گوبر سے لیپ دیا۔ پھر ان پر کمر یا مٹی پھیر دی۔ اب ان پر مکی کے بھٹوں کے انبار جمع کیے اور ان پر بیلوں کو چکر دے دے کر چلایا تاکہ دانے بھٹوں سے الگ ہو جائیں۔ کچھ بھٹے تو اس طرح سے بالکل صاف ہو گئے مگر بہت سے بھٹے صحیح سالم نکلے اور بیلوں کے پاؤں تلے روندے جا کر بھی انھوں نے مکی کے دانوں کو اپنے [illegible] سے الگ نہ کیا۔ پھر سارو گاؤں والوں کی ٹولیاں بنیں۔ لوگ چاندنی راتوں کو اکٹھے [illegible] قطعوں میں بیٹھے ہوتے ہیں اور بھٹوں سے دانے الگ کر رہے ہیں۔ نیچے بہتی ہوئی ندی کا [illegible] سا شور ہے۔ منو کی شاخوں میں چاند اٹک گیا ہے اور اس اداس نغمے کو سن رہا ہے جو نوجوان کسان اور ان کی مائیں اور بہنیں اور بیویاں گا رہی ہیں۔ پھر وہ یکایک چپ ہو جاتے ہیں اور خاموشی سے مکی کے دانوں کو الگ کر رہے ہیں۔ ہوا کے نہایت ہلکے ہلکے جھونکے آتے [illegible] منو کا سارا درخت سانس لیتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کوئی آگ تاپتا ہوا بوڑھا [illegible]

سے کہہ اٹھتا ہے، "اور گاؤ، بیٹو، اور گاؤ!" پھر وہ خود ہی کوئی پرانا گیت شروع کر دیتا ہے۔ اُسے اپنی ختم ہوتی ہوئی زندگی کی بہار یاد آرہی ہے زرد زرد شعلوں کی چمک اس کی آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں میں لرزلرز جاتی ہے۔ گاتے گاتے گیت کے الفاظ اُس کے منہ میں لڑکھڑا جاتے ہیں۔ اب وہ چپ ہو جاتا ہے اور آگ کے دہکتے ہوئے کوئلوں پر مکی کا ایک بھٹا بھون رہا ہے۔ نوجوان چرواہیاں آپس میں سرگوشیاں کرتی ہوئی یکایک ہنس پڑتی ہیں۔ نوجوان گڈریے انہیں کنکھیوں سے دیکھ کر مسکراتے ہیں، پھر کوئی ہجر کا نغمہ فضا میں گونج اٹھتا ہے۔ نوجوان چرواہیوں کی پتلی پتلی آوازیں بھی ان میں شامل ہو جاتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی بڑے معبد میں بیٹھے ہوئے اپنے معبود کی حمد وثنا کر رہے ہیں۔ مکی کے دانے کسی تسبیح کے بیشمار دانے ہیں۔ وہ بوڑھا کسان ایک بوڑھا پجاری ہے۔ اس آگ میں عنبر اور لوبان جل رہا ہے جس کا دھواں اُٹھ کر سارے معبد کو معطر کر رہا ہے۔ یہ نیک نفس روحیں ہیں، یہاں ابدی سکون ہے اور قدرت کا رحم!

سارے گاؤں والے مسافر کو ایک عزیز مہمان بلکہ اپنا بھائی سمجھتے اور اسے اپنی خوشیوں میں شریک کرتے۔ بھولے بھالے کسان، الھڑ چرواہیاں، ننھے ننھے بچے اس کے گرد جمع ہو جاتے: "مسافر اپنی تاروں والی بنسری سناؤ، مسافر اپنی تاروں والی بنسری سناؤ۔" آگی اس کے شانے پہ اپنی بانہہ ٹیک دیتی اور دوسری بانہہ سے اس کی انگلیوں میں مضراب کو پکڑا کر کہتی: "بجاؤ، راہی اپنی تاروں والی بنسری بجاؤ۔" یا پھر کھلیانوں کے لمبے لمبے سایوں میں کوئی اس سے کسی کہانی کی فرمائش کرتا، اُس دنیا کی کہانی جہاں لمبے لمبے میدان ہیں، بڑے بڑے دریا ہیں، میلوں تک پھیلے ہوئے شہر ہیں جہاں لوہے

کے تاروں پر لکڑی کے مکان قطار بنائے ہوئے بھاگے جا رہے ہیں۔ کہیں سے کوئی ایک بٹن دبا دیتا ہے اور لاکھوں چراغ روشن ہو جاتے ہیں۔ آسمان پر اُڑن کھٹولے گھوم رہے ہیں اور نیچے بازاروں میں وہ پریاں محوِ خرام ہیں جن کے لباس تیتریوں کے پروں سے بنائے گئے ہیں۔

اس طرح مکی کے کھلیانوں میں کئی بہار کی راتیں گزر گئیں۔ ایک رات مسافر نے پہلے قطعے میں فیروز کا الغوزہ سنتے ہوئے محسوس کیا کہ آنگی وہاں نہیں ہے۔ دوسرے قطعے میں مکی کے دانوں کو بھٹوں سے الگ کرتے ہوئے اس نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر آنگی کہیں نظر نہ آئی۔ تیسرے قطعے میں مسافر نے ایک دلکش کہانی سنائی جو شہروں کی زندگی کے متعلق تھی۔ اس کی نگاہیں آنگی کو تلاش کرتی رہیں۔ مگر بے سود۔ چوتھے قطعے میں اس نے اپنی وائلن کو نکالا اور ایک دل سوز نغمہ چھیڑا۔ باقی قطعوں سے اُٹھ کر سارے گاؤں والے چوتھے قطعے میں آ جمع ہوئے اور مسافر کی بنسری سننے لگے۔ اُن کے چہروں پر خوشی تھی۔ اور حیرت بھی ــــ مگر آنگی کہاں تھی؟

آخر مسافر نے پوچھ ہی لیا۔

ایک نوجوان کسان نے بے پروائی سے کہا: "کھلیان کے اس طرف بیٹھی ہے۔ ابھی تھوڑا عرصہ ہوا اپنی سہیلیوں میں بیٹھی گا رہی تھی کہ فیروز کی بہن نے نہ جانے اُسے کیا کہا۔ کیوں دلشاد تم نے کیا کہا کہ وہ اُٹھ کر چلی گئی اور جھولی میں بہت سے بھٹے بھر کر لے گئی۔ اب اکیلی بیٹھی دانے الگ کر رہی ہو گی۔ کون منا تا پھرے؟ کرن تم کیوں نہیں جا کر منا لاتی اُسے؟"

کرن ہنس پڑی۔ مگر اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

کھلیان کے دوسری طرف مسافر نے دیکھا کہ چند مکی کے بھٹے زمین پر پڑے ہیں اور اُن کے قریب کھلیان کا سہارا لیے ہوئے آنگی نیم دراز حالت میں پڑی ہے۔ آنکھیں نیم وا ہیں اور چاند کی کرنوں نے اس کے سر کے گرد ایک ہالہ سا بنا دیا ہے۔

آنگی!

آنگی!!

آنگی!!!

مسافر آنگی پر جھک گیا۔ اس نے آنگی کے سر کو اپنے بازوؤں میں لے لیا "کیا بات ہے آنگی؟"

آنگی اُٹھ بیٹھی۔ اُس نے آہستہ سے اپنے آپ کو مسافر کے بازوؤں سے علیحدہ کر لیا اور مکی کے دانے الگ کرنے لگی۔

آخر اس نے گھٹے ہوئے لہجے میں کہا: "آہ! مسافر مجھے یہاں سے لے چلو!" یہ کہہ کر اس نے سر جھکا لیا اور چپ چاپ رونے لگی۔

مسافر خاموشی سے مکی کے دانے الگ کرتا رہا۔ اس نے آنگی کے آنسو نہیں پونچھے۔ اُس نے اُسے پیار نہیں کیا۔ یکایک ایک پرندہ اپنے سیاہ پر پھیلائے ہوئے تیر کی طرح سامنے سے نکل گیا۔ کھلیان کے اوپر دو تین ستارے چمک رہے تھے، آنگی کے آنسوؤں کی طرح اور کھلیان کے دوسری جانب عورتیں نئی دلہن کی سسرال روانگی کا گیت گا رہی تھیں۔ مسافر کی نگاہیں پہاڑوں سے پرے سبز بنوں کے جنگلوں کو چیر کر وسیع میدانوں کو ڈھونڈنے لگیں جہاں اس کا دیس تھا۔ اس کی نگاہوں میں ریل گاڑی کے پہیے اچھلنے لگے۔

مسافر خدا کا شکر بجا لاتا ہے کہ وہ اپنی دنیا میں واپس آ گیا۔ اپنی تہذیب کی دنیا میں۔ کبھی خیال کرتا ہے شاید میں نے غلطی کی۔ کبھی کبھی اپنے دوستوں کی محفل میں بیٹھے بیٹھے خوش فعلیاں کرتے ہوئے اس کے کانوں میں عجیب عجیب الفاظ گونجنے لگتے ہیں: "راہی تم کتنے عجیب ہو، راہی۔" حتیٰ کہ اس کے چہرے سے مسکراہٹ کافور ہو جاتی ہے اور وہ سوچتا ہے: شاید کسی نیلے جھرنے پر ریوڑ کو پانی پلاتے ہوئے ایک غریب لڑکی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ اس کے پاؤں ننگے ہیں، اس کی نگاہیں اداس ہیں، اس کے بالوں میں سیب کے پھولوں کا گچھا ہے!

آ گی!–

صرف ایک آنہ

سروش کنگس جارج ڈاکس پہ گیا۔ وہاں اسے ایک فورمین مل گیا۔ فورمین نے ایک نیلے رنگ کی قمیص اور پتلون پہن رکھی تھی جس پر جا بجا تیل کے دھبے نظر آ رہے تھے اور اس کی چھوٹی سی ناک پہ ایک بہت بڑی عینک تھی۔ بہ حیثیتِ مجموعی وہ ایک گندہ، بد نما اور رحم دل انسان نظر آتا تھا۔ سروش کو اس کی آنکھوں میں نرمی و ملائمت کی ایک خفیفہ سی جھلک دکھائی دی پس اُس نے فورمین سے ملتے ہی کہہ دیا کہ وہ ایک "بے کار" ہے اور کسی کام کی تلاش میں یہاں آیا ہے۔

"تم کیا کر سکتے ہو؟" فورمین نے پوچھا۔

"میں نے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی ہے۔" سروش نے جلدی سے جواب دیا۔

"بے فائدہ۔ کیا تم بوجھ اُٹھا سکتے ہو؟ بھاری بوجھ؟"

"نہیں۔"

"کیا تم کرین پر کام لے سکتے ہو؟"

"نہیں تو۔ مگر شاید کر سکوں۔ میرا باپ انجینئر تھا اور میرا بیٹا دونوں سے بھوکا مر گیا۔"

"تو یہیں جنس پڑا۔" "تم مجھے اچھے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ کاش میں تمہاری مدد کر سکتا۔

مگر ہم یہاں تعلیم یافتہ، میرا مطلب ہے ہم یہاں ڈگری یافتہ لوگوں کو ملازمت نہیں دیتے۔

وہ عام طور پر کمزور ہوتے ہیں۔ جسمانی کمزوری اور کام کرنے کی صلاحیت بھی اُن میں کم

ہی ہوتی ہے اور پھر تم تو فن سے بھی بے بہرہ ہو۔ مجھے بہت افسوس ہے، لیکن اگر تم ہوڑہ

پل پر چلے جاؤ تو شاید کام بن جائے۔ میں نے سنا ہے وہاں تعلیم یافتہ لوگوں کو ملازمت ملتی ہے۔"

"کہاں؟" سروش نے پوچھا۔

"ہوڑہ پل پر! کیا تم نے سنا نہیں؟"

سروش ہوڑہ پل پر گیا۔

ایک چھوٹے سے لکڑی کے تختوں سے بنے ہوئے کیبن میں، جس کی کھڑکیوں میں سرخ

اور سبز رنگ کے شیشے لگے ہوئے تھے، ایک یوریشین بیٹھا تھا۔ سروش اس کے قریب بڑھا

اور سوال دراز کیا: "تم جانتے ہو تمہیں یہاں کیا کرنا پڑے گا؟" یوریشین نے اپنی ناک

کے نتھنوں کو پھلاتے ہوئے کہا "بہت مشکل کام ہے اور غالباً تم اسے نہ کر سکو گے۔ اور شاید

پسند بھی نہ کرو۔"

"کیا کام ہوگا؟" سروش نے پوچھا۔ "مگر ٹھہرو، مجھے نہ بتاؤ میں اسے کر لوں گا۔"

یوریشین نے مسکراتے ہوئے کہا "ہم تنخواہ معقول دیتے ہیں۔ ہاں تو تین روپیہ روزانہ

روزانہ میں صرف دس گھنٹے کام ہے۔ وہ رُک گیا اور کھڑکی سے باہر تکنے لگا۔ ایک گدلے پانیوں

کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر یک لخت وہ سروش کی جانب مڑا۔ "کیا تم یورپین ہو؟"

"نہیں۔"

"ہوں، میرا بھی یہی خیال تھا۔"

"کیا تم ایک لوہے کی میخ کو لکڑی کے تختے میں سیدھا گاڑ سکتے ہو؟" پوریشین نے پوچھا۔ "میں تم سے یہ سوال اس لیے کر رہا ہوں کہ یہی کام تمہیں اس پُل پر کرنا ہوگا۔ میخیں گاڑنا اور بس لکڑی کے تختوں میں میخیں گاڑتے چلے جانا۔ کیا تم ایسے کر سکو گے؟"

"کر سکوں گا۔" سروش نے جواب میں کہا۔ "میرا باپ انجینئر..."

"چپ چپ!" پوریشین نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے تمہارے شجرۂ نسب سے کوئی دلچسپی نہیں۔" یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے رکا پھر سروش کی طرف دیکھ کر کہنے لگا، "ساٹھ روپے میں یہ کام ہو سکتا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے پھر ایک پرمعنی انداز میں سروش کی جانب دیکھا۔

"سروش نے کمزور لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن میرے پاس تو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔"

پوریشین کو غصہ آ گیا، کہنے لگا: "میں کہتا ہوں کیا تم مجھے گاؤدی تصور کرتے ہو؟ میرے پاس ملازمت کے لیے درخواست کرنے آئے ہو۔ کیا میں تمہارا چچا ہوں (میز پر مکہ مار کر)۔ ہم یہاں صرف پوریشین لوگوں کو ملازمت دیتے ہیں، سمجھے! مگر میں شاید اس امر کی پروا نہ کرتا۔ کیا ساٹھ روپے زیادہ ہیں؟ اور پھر تم تو اس کام سے بھی واقف نہیں ہو۔ کیا تم ایک لوہے کی میخ سیدھی طرح لکڑی کے تختوں میں سے گزار سکتے ہو؟ مجھے شبہ ہے۔ تم بہت ہی ناتجربہ کار ہو۔ کیا تم نے کسی صنعتی درس گاہ میں تعلیم پائی ہے؟ لیکن میں اسے بھی بھلائے دیتا ہوں۔ صرف ساٹھ روپوں کے بدلے یہ رقم زیادہ نہیں۔ اور جب تم نوکر ہو جاؤ گے اور تین روپے روزانہ مشاہرہ حاصل کرو گے تو تم یقیناً میرے شکر گزار ہو گے۔ تو نکالو روپے کیا کہتے ہو۔

یوریشین نے اپنی تقریر ختم کی اور مربیانہ انداز سے سروش کی طرف دیکھنے لگا۔

"لیکن ... لیکن،" سروش نے کانپتے ہوئے لہجہ میں کہا "میرے پاس تو ایک کوڑی بھی نہیں، ایمان سے کہتا ہوں"

یوریشین نے جواب میں اپنے کندھوں کو ایک اضطراری حرکت دی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

سروش نے آہستہ سے کہا "میں تمہیں اپنی تنخواہ سے دو روپیہ ماہوار دینے کو تیار ہوں۔ مگر ـــــ"

یوریشین نے اپنے مخصوص اینگلو انڈین لہجے میں کہا: "سب فضول باتیں ہیں۔" اب وہ ہر ایک لفظ پر زور دے کر فقرہ ادا کر رہا تھا "ایک دفعہ جس دن تمہارا نام رجسٹر میں درج ہو گیا تم بہت اختیار سے باہر ہو گئے۔ سمجھے؟"

سروش چند لمحوں کے لیے چپ رہا۔ وہ حیران تھا کہ کیا کرے؟ ساٹھ روپے کہاں سے لائے؟ کس سے مانگے؟ کون اسے ادھار دے گا؟ اس کے پاس تو کوئی ایسی چیز بھی نہ تھی جسے وہ گروی رکھ سکتا۔ وہ دو دن سے بھوکا تھا۔ وہ پھر یوریشین سے ملتجی ہوا:

"آپ مجھ پر یقین کیجیے،" سروش نے نہایت لجاجت سے کہا "میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ..."

مگر یوریشین نے اسے فوراً روک دیا۔ کہنے لگا "چلو نکلو یہاں سے۔ قسمیں کھاتے ہو، یہ کوئی گرجا گھر نہیں ہے۔"

جب سروش باہر نکلا تو مغرب میں آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ ایک دخانی جہاز کی گھنٹی متواتر چیخ چیخ کر جہاز والے مزدوروں کو بلا رہی تھی۔ ہگلی کا پانی شعاعوں کے

انعکاس سے سُرخ تھا۔ سرویش کو ایسا ہوا جیسے کسی نے آسمان کے قریبی کرنے میں
سورج کو حلال کر دیا ہے اور اب اس کا لہو بہہ کر گنگا میں آ رہا ہے۔ اُس نے ایسا محسوس کیا کیونکہ
فضا ایسی ہی موت کا سا سکوت تھا اور ایک گرم گھٹن۔ یہ بوگنڈی کے گیلے تختوں سے اُٹھ رہی
تھی۔ یکایک پاس کے گھاٹ سے کووں کا ایک جھنڈ کرخت آواز میں کائیں کائیں کرتا
ہوا مغرب کی جانب پرواز کر گیا۔ سرویش نے ایک آہ بھری اور یونہی ایک سمت کو چل پڑا۔

سرویش نے کوڑا کرکٹ اٹھانے والی کارپوریشن کی لاری کو دیکھا جو ایک بجلی کے
پاس کھڑی تھی۔ لاری چلانے والا قریب کی ایک دکان سے پان خرید رہا تھا۔ دن بھر کا چارہ
یکایک ایک چھوٹا سا غریب بازاری کتا کہیں سے آ نکلا۔ سردی سے ٹھٹھرتا ہوا۔ دم دبائے
ہوئے لاری کے قریب پہنچا اور پہیوں کو سونگھنے لگا۔ پھر آہستہ آہستہ پتلی سی آواز میں چلانے
لگا۔ بیچارا غریب کتا شاید کئی دن سے بھوکا تھا اور اب بیٹھے سے اڑتی ہوئی گاڑی سے دنیا
کی بو اس کے نتھنوں میں گھسی جا رہی تھی، اس کے دماغ پر مسلط ہو رہی تھی۔ اُس کی اشتہا
کی تہہ اذیت پہنچا رہی تھی۔ بھوک کے سرویش نے محسوس کیا کہ اگر اس وقت اس کی نگاہوں
کے سامنے بھنی ہوئی مچھلی کی پلیٹ ہو تو اس کی اشتہا انگیز بو بھی اسی طرح اس کے دماغ
کو پریشان کر دے گی۔

کتے کی چیخیں بلند ہوتی گئیں۔ وہ پہیوں کے گرد چکر کاٹ رہا تھا۔ بیچارا لاری کے
اوپر تو نہیں چڑھ سکتا تھا۔ شاید وہ عالم تصور میں عمدہ عمدہ پکوانوں کو دیکھ رہا تھا۔
چچوڑی ہوئی ہڈی، باسی ڈبل روٹی کے ریزے۔ اتنے میں ڈرائیور آ گیا۔ پانوں کا بیڑہ سنبھالے
ہوئے آتے ہی اُس نے کتے کی کمر میں زور سے ایک لات جمائی۔ ایک لمبی بلند چیخ، جیسے کوئی

انسان کی ہوتی ہے اگر اُسے ایک دو ٹھڈے لگا دیے جائیں۔ بچارا کتا بھاگ نکلا۔ اس کی چھوٹی سی دُم پچھلی ٹانگوں کے درمیان سے گزر کر پیٹ سے جا لگی تھی۔ کتا بھاگتا ہوا سڑک کی دوسری طرف چلا گیا جدھر سروش کھڑا تھا "وہ چاؤں چاؤں" کر رہا تھا۔ سروش کو چپ چاپ کھڑے دیکھ کر اور اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے اپنی چیخیں کم کر دیں۔ پھر دو تین ہی چیخوں کے بعد وہ چپ ہو گیا اور سروش کے قریب کھڑا ہو کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے دم ہلانے لگا

یہ جذبہ پُر امید تھا کہ اظہارِ ہمدردی؟

کتا سروش کے قدموں کے آگے گھومنے لگا جس طرح پہلے وہ لاری کے پہیوں کے گرد گھومتا تھا، لیکن اب وہ زیادہ پُر امید معلوم ہوتا تھا۔ وہ بار بار دم ہلا رہا تھا، بار بار زمین سونگھ رہا تھا۔ پھر وہ یکایک کھڑا ہو گیا، اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں سروش کے چہرے پر جما دیں اور دم ہلانے لگا۔

"ایک بسکٹ کھاؤ گے، بسکٹ؟"

یہ سروش کا آخری بسکٹ تھا۔ اس نے اُسے جیب سے نکال لیا۔ کتنا خشک اور کرارا دکھائی دے رہا تھا۔ چھوٹے کتے نے اُسے دیکھ لیا تھا اور اب وہ چھوٹی چھوٹی چیخیں مارتا ہوا خوشی سے سروش کے گرد اچھل رہا تھا اور زور زور سے دم ہلا رہا تھا۔ آخر سروش کو وہ بسکٹ دینا ہی پڑا۔ کتے نے ایک سیکنڈ میں اسے حلق کے نیچے اتار لیا۔ ایک لمحہ بھی زیادہ عرصہ ہوتا ہے۔ سروش شاید کتے کی آنکھوں میں آنسو بھی دیکھ رہا تھا۔ ایک بھوکا آدمی تھا اور ایک بھوکا کتا اور اب دونوں سڑک کے کنارے چپ چاپ معصوم کھڑے تھے جیسے دنیا سے باہر نکال دیے گئے ہیں۔

ایک لمبے وقفے کے بعد سروش نے سر جھٹکا یا اور ایک طرف کو چل پڑا۔ کتا آہستہ

آہستہ اُس کے پیچھے آ رہا تھا۔

وہ رات اُس نے سیالدہ سٹیشن پہ بسر کی۔ تھرڈ کلاس ویٹنگ روم کا پختہ فرش جس پر سیمنٹ لگا ہوا تھا۔ سخت اور ٹھنڈا تھا۔ اُسے مشکل ہی سے ویٹنگ روم کہا جا سکتا تھا کیونکہ یہ ایک کمرہ تو نہ تھا بلکہ محض ایک برآمدہ سا تھا تین اطراف سے کھلا اور چھت پر ٹین کے پرانے تختے اور چھت کے نیچے کہیں کہیں لوہے کے کھمبے تاکہ چھت کو سہارا رہے اور گرنے نہ پائے۔ سرورش اس برآمدے سے باہر سیاہ آسمان پر انگاروں کی طرح دہکتے ہوئے ستاروں کو دیکھ سکتا تھا اور وہاں ایک پیلا سا مٹیالی رنگت کا چاند بھی دکھائی دے رہا تھا۔ یہ چاند ایک پکے ہوئے ولایتی کیک کی مانند تھا جو ابھی ابھی انگیٹھی سے باہر نکالا گیا ہو۔ سرورش نے اُسے دیکھتے دیکھتے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہاں اور وہ تھکا ہوا تھا اور بھوکا تھا۔ دن بھر وہ پیدل چلتا رہا اور کلکتے کی گلیوں، اس کے شاندار بازاروں اور ویران چوکوں میں گھومتا رہا تھا۔ وہ ایک پاگل آدمی کی طرح چکر کاٹتا رہا، اس دیوالیے کی طرح جو محض اپنے پیٹ کے بھرنے کو دیوانہ ہو گیا ہو لیکن اُسے نوکری کہیں نہ ملی۔ اُسے نوکری کیوں نہ ملتی تھی؟ کیوں لوگ اس کے زرد چہرے کو دیکھ کر چڑ جاتے تھے جیسے کسی چیز نے انہیں شرمندہ کر دیا ہو لیکن کیوں؟ مگر اب سرورش کو ان باتوں کی پروا نہ تھی۔ وہ آج بہت تھکا ہوا تھا۔ اس کا دماغ کام کرنے سے رک گیا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ شاید اُس کے دھڑ کے ساتھ ٹانگیں نہیں ہیں۔ ایسے جیسے کہ نکال دی گئی ہیں جیسے شراب کا نشہ ہو۔ پھر اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی اندر داخل ہو کر اس کے جسم کی ہڈیوں کو توڑ رہا ہے۔ اس کے معدے کو مٹھی میں دبا کر زور سے کھینچ رہا ہے اور اس کے ماتھے پر تیز تیز ہتھوڑیاں چھوڑ رہا ہے۔ آہ!

اس نے اپنی ٹانگیں فرش پر پسار دیں اور بازو پھیلا دیئے۔ ہال سیمنٹ کا فرش خوب ٹھنڈا تھا۔ اُسے تھوڑا سا سکون حاصل ہونے لگا۔ تکان سے اینٹھے ہوئے اعضا آہستہ آہستہ ڈھیلے پڑنے لگے۔ اب اُسے اگر کہیں سے تھوڑی سی روٹی مل جاتی! بس ایک دو ٹکڑے۔ بیوقوف، اس نے اپنا بسکٹ کتے کو کیوں دے ڈالا، بیوقوف! سروش آہستہ آہستہ اپنے ننگے بازوؤں کو فرش پر پھیلانے لگا۔ ہاں فرش خوب ٹھنڈا تھا۔ ٹھنڈا، صاف اور خشک۔ گلی یا سڑک کے فٹ پاتھ کی طرح نمدار اور گرد آلود نہیں تھا۔ مجھے آئندہ یہاں ہی سونا چاہیئے۔ اس نے دل میں سوچا۔ یہ جگہ اس وقت تو کافی ویران دکھائی دیتی ہے اور پھر یہاں کوئی پولیس کا سپاہی بھی نظر نہیں آتا اور کسی کمینے انسان نے بجلی کا بلب بھی توڑ دیا ہے۔ یکایک اس کا ہاتھ کسی نرم گرم شے سے ٹکرایا۔ یہ ایک ہاتھ تھا۔ یونہی، غیر شعوری طور پر ہی اس نے اس کی انگلیوں کو چھوا۔ پھر اس کی ہتھیلی کو، پھر کلائی۔ اس کے بعد اس کی انگلیاں ایک کانچ کی چوڑی پر جا کر رک گئیں۔ سروش نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے نزدیک ایک کونے میں ایک عورت گھٹنے سمیٹے ہوئے لیٹی تھی۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔ وہ سو رہی تھی۔ اس کا سیاہ بازو نرم اور گداز تھا۔ اس کی دھیمی سانس باقاعدگی سے چل رہی تھی۔ یک لخت پلٹ کر وہ اس کے پہلو کی طرف مڑ گیا۔

"تم کون ہو؟" عورت نے ایک مدھم مغموم لہجے میں پوچھا۔ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے ایک مرتبہ سروش کی طرف دیکھا پھر انہیں بند کر لیا۔ وہ ایک غریب بھیک مانگنے والی عورت تھی۔ وہ غریب تھی اور بدصورت اور بے حد تھکی ہوئی۔ اُسے کس کی پروا ہو سکتی تھی!

صبح کے دھندلکے میں پولیس کے ایک سپاہی نے ٹھوکر سے سروش کو جگا دیا اور

دھکا دے کر ویٹنگ روم سے باہر نکال دیا۔ عورت سروش سے پہلے ہی کہیں جا چکی تھی۔ خدا جانے کدھر۔

"دوسری مرتبہ اگر میں نے تمہیں یہاں سوتے ہوئے دیکھا!" پولیس کا سپاہی کہہ رہا تھا۔ "تو میں تمہیں سیدھا جیل خانے پہنچا کر دم لوں گا۔ حرام زادہ کہیں کا۔ سور کا بچہ۔ نکل یہاں سے۔۔۔" سروش آنکھیں ملتا ہوا ایک طرف کو چل پڑا۔ سپاہی کی گالیوں کا اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ کیسی اچھی رات تھی اور وہاں اس مہربان بھیک مانگنے والی عورت نے اسے کتنا آرام دیا تھا۔ ایک میلے سے چیتھڑے میں، جسے وہ اپنے سر کے نیچے دبائے ہوئے تھی، بہت سی عمدہ عمدہ چیزیں بندھی تھیں؛ چند کھجوریں، ایک ناریل اور ایک پوری روٹی۔

اب وہ کہاں تھی؟ کیا وہ اسے پہچان سکے گا؟ مہربان بھکارن!

یکایک کسی نے اُسے دھکا دیا: "کیا تمہاری آنکھیں۔۔۔ کیا۔۔۔ کیا تم اندھے ہو گئے ہو؟" ایک موٹا بابو کہہ رہا تھا۔ "راستہ دیکھ کر نہیں چلتے۔ سر پر چڑھے آتے ہو۔۔۔ حرامی بھیک منگے۔۔۔ بدمعاش!" اسی طرح گالیاں دیتا ہوا موٹا بابو آگے گزر گیا۔

لیکن شاید سروش نے اسے نہیں سنا۔ وہ بہت دور اپنے خیالوں کی دنیا میں گم تھا اور ساری کائنات اس کے گرد چکر کاٹ کاٹ کر واپس بھاگ رہی تھی۔ اس نے سوچا: کتنا ہی اچھا ہو اگر وہ ایک بھکاری بن جائے۔ اس میں برائی ہی کیا ہے؟ اب تو یوں بھی اُسے لوگ بھیک منگا سمجھتے ہیں؛ اور پھر بھیک منگے انسانوں سے زیادہ رحم دل ہوتے ہیں۔

منگو بھکاریوں کا سردار، ٹانگیں پھیلائے چٹائی پر حقہ پی رہا تھا۔ اس کی توند

ہو چکی تھی اور داڑھی سفید۔ اس نے سروش کو کھلے گلے اور لمبے کالروں والی ململی قمیض دی
اور نیلی سرج کا کوٹ جس پر تیل کے بڑے بڑے دھبّے تھے اور ایک گرے فلالین کی پتلون
اور ایک چمڑے کا بیگ۔ "یہ لو بیٹا،" منگو نے کہا۔ "ان کپڑوں کو پہن لو اور اس بیگ کو
ہاتھ میں تھامے رکھو۔ دیکھو اس بیگ میں کیا ہے۔" اس نے بیگ کھولتے ہوئے کہا۔ "ایک
پرانی قمیض، ایک دانت صاف کرنے والا برش، ایک پرانا اُسترہ، زنگ آلود اور گھسے ہوئے
صابن کی ڈبیہ۔ بس یہی تمہارے ہتھیار ہیں، یہی تمہاری دوکان ہے۔ ان سے اچھی طرح
فائدہ حاصل کرو۔ تم کہتے ہو کہ تم کلکتہ یونیورسٹی کے گریجویٹ ہو۔ میں اس بات پر بغیر سرٹیفکیٹ
دیکھے یقین کر لیتا ہوں۔ ہمارے ٹولے میں کئی دسویں پاس بھکاری ہیں لیکن تم پہلے گریجویٹ
بھکاری ہو۔ جیسا میں نے شروع میں کہا مجھے تم پر اعتماد ہے۔ تمہاری لیاقت پر، تمہاری دانائی پر
مجھے اُمید ہے کہ تم ہمارے پیشے کے لیے باعثِ فخر ہوگے۔ اب اسی پیشے کو پکڑ لو، ہمیشہ کے
لیے اور اپنی ان تمام چالاکیوں کو کام میں لاؤ جو تم نے زمانۂ تعلیم میں حاصل کی ہیں۔ اگر تم
ہوشیار رہے تو ایک دن میری جگہ حاصل کر لوگے۔ لوگ کہتے ہیں کہ کلکتہ انگریزی سلطنت
میں، جہاں آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا، وسعت اور آبادی کے لحاظ سے دوسرا شہر
ہے۔ میں نہیں جانتا یہ سچ بھی ہے کہ نہیں لیکن اگر ایسا ہو تو کالی ماتا تمہیں توفیق دیں کہ
تم اس کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکو، لو بیٹا۔" منگو نے اپنی تقریر ختم کی اور پھر
چند دقیقوں کے لیے رُک گیا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر اس نے چٹائی کے قریب پڑے ہوئے
بوٹوں کے ایک جوڑے کو اٹھا لیا اور سروش کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔ "اوہ
ہاں بیٹا میں تو انہیں بالکل ہی بھول گیا تھا، انہیں بھی پہن لو۔"

سروش چٹائی پر بیٹھ کر انہیں پہننے لگا۔ بہت پرانے بوٹ تھے۔ سوکھا ہوا چمڑا

کرم خوردہ، بے رنگ، بدزیب۔ یکایک سروش کی نگاہیں ایک سبز لیبل پر پڑیں جو بوٹ کے اندر لگا ہوا تھا۔ سروش کو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اُس کے کلیجے میں برچھی بھونک دی ہو۔ یہ ان کے نیا مارکہ بوٹ تھا۔ وہی پرانا سبز لیبل۔ انہیں بوٹوں کو وہ ہمیشہ کالج کے دنوں میں جانسن اینڈ کو کی دکان سے خریدا کرتا تھا۔ شاید یہ قسمت کی وحشیانہ بے رحمی تھی۔ کوئی اس کے دل کو مسوس رہا تھا۔ یکایک اُس کا گلا بند ہونے لگا۔ کوئی غیر مرئی طاقت اپنے آہنی ہاتھوں سے اس کے گلے کو دبا رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اگر وہ اس وقت نہ بول سکا تو پھر شاید ہمیشہ کے لیے چپ ہو جائے گا، مر جائے گا۔ اس نے بازوؤں سے ہوا میں کسی کو پکڑنے کی کوشش کی، اس نے منہ کھول کر ہوا کے ایک دو گھونٹ نیچے اتارنے کی کوشش کی، اس نے بولنا چاہا، اور پھر یکایک اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور ایک بلند وحشیانہ چیخ یا ہنسی اس کے لبوں سے پھوٹ نکلی۔ وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا بند بند ہنسی سے کانپ رہا تھا۔

قسمت بھنور منگت رام نے کانپتے ہوئے کہا، کالی ماتا کی جے [illegible] سروش چپ چاپ کیا بیٹھا رہا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ تیز تیز سانس [illegible] خشک [illegible] رخساروں کو [illegible] لمبے لمبے کالروں والی ململ کی قمیص [illegible] بھاگ گیا

اس دن دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں پیر جن ایلمی نیوز کے پاس ہال سنگھ ٹیکسی ڈرائیور

کو ایک پولیس سارجنٹ نے روک لیا۔ ایک حادثہ ہو گیا تھا جس میں ایک آدمی ایک تیزی سے بھاگتی ہوئی لاری سے ٹکرا کر زخمی ہو گیا تھا۔ مان سنگھ نے دیکھا کر سڑک کے درمیان لہو سے سرخ جگہ پر ایک آدمی بے ہوش پڑا تھا۔ وہ ایک پرانا نیلا کوٹ پہنے تھا اور اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچی ہوئی تھیں۔ پولیس سارجنٹ نے مان سنگھ کو مدد کے لیے کہا۔ مان سنگھ اور پولیس سارجنٹ دونوں نے مل کر اس آدمی کو ٹیکسی میں لٹا دیا۔ جب مان سنگھ نے بے ہوش آدمی کا جسم ایک لمبی سیٹ پر رکھا اور اس کی بھینچی ہوئی مٹھیوں کو ٹھیک کیا تو اس نے دیکھا کہ دائیں ہاتھ کی گھٹی ہوئی ہتھیلی میں کوئی چمکتی ہوئی چیز دبی پڑی ہے۔ اس نے جھک کر غور سے دیکھا۔ یہ ایک آنہ تھا!

لاہور سے بہرام گلہ تک

میں اور کلیم مشن کالج کی لائبریری میں بیٹھے چینی مصوری کے متعلق ایک کتاب دیکھ رہے تھے، یا یوں کہیے کہ کتاب کی چادر پر نظر تصاویر پر اچٹتی ہوئی نگاہیں ڈال رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ باتیں بھی کر رہے تھے۔ گفتگو گو آہستہ آہستہ ہو رہی تھی پھر بھی لائبریری کے وسیع سناٹے میں شہد کی مکھیوں کے بھنبھنانے کی سی گونج پیدا ہو گئی تھی۔ گفتگو کا موضوع نہایت دلچسپ تھا: یہی سینما کی ایکٹریسیں، کچھ کا ٹھاٹھ، وغیرہ دلفریب ساڑھیاں، [illegible] کی حماقتیں، وغیرہ وغیرہ۔

یونہی اوراق الٹتے الٹتے لی مانگ کی مشہور و مقبول تصویر "شفق" سامنے آگئی۔ وہی ٹیڑھے ترچھے نقوش، چغتائی آرٹ سے ملتے جلتے مدھم رنگ، جھیل کے پھیکے سے نیلے پانی میں مغربی پہاڑوں کی سبز سبز چوٹیاں اور ان پر پھیلے ہوئے افق پر جھکتے ہوئے نارنجی بادلوں کا انعکاس۔ لی مانگ کی مصوری حقیقت میں مسحور کن ہے۔

کلیم نے اپنی لمبی، بے چین، مخروطی انگلیاں، جو اس کے طبعی رجحان کو غیر شعوری طور پر واضح کر رہی تھیں، آہستہ سے "شفق" پر رکھ دیں اور پھر میری طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا:

"میں پرسوں شملے جا رہا ہوں، کاظمی کی کوٹھی خالی پڑی ہے، تم بھی چلو!"

میں نے سر ہلا کر انکار کر دیا: "اس مرتبہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں لاہور سے کہیں باہر نہ جا سکوں گا۔"

کلیم نے پوچھا: "وہ کیوں؟"

"میں نے کہا: "کیا کہوں، کچھ حالات ہی ایسے ہیں۔"

کلیم چپ ہو رہا اور رنی بانگ کی "شفق" کو غور سے دیکھنے لگا۔ شاید اسے اس چینی شاہکار میں شملے کے ابھرتے ہوئے نقوش نظر آ رہے تھے۔

مگر حالات بدلتے کیا دیر لگتی ہے؟ میں لائبریری سے اُٹھ کر گھر آیا تو گلند نے (میرا نوکر بے چارا) جلدی سے ایک تار میرے حوالے کیا۔ لفافہ چاک کر کے پڑھا، لکھا تھا:

"میرپور، کشمیر

"میری شادی ہے بیس جون، جلدی پہنچو۔

"گوربخش"

اچھا تو یہ بات تھی۔ مدت سے مجھے گوربخش کا کوئی خط نہ ملا تھا اور میں حیران تھا کہ آخر اس کو اس کی سستی پر محمول کروں یا اس کی بے وفائی پر۔ آج معلوم ہوا کہ خط نہ لکھنے کے اور بھی بہت اسباب ہو سکتے ہیں مثلاً: محبت، شادی، موت اور علیٰ ہذا القیاس۔

گوربخش میرا جگری دوست ہے۔ مکتب کی شرارتوں میں ہم دونوں نے ہمیشہ اکٹھے حصہ لیا اور عموماً اکٹھے ہی پیٹے۔ دو معصوم دلوں کی رفاقت کے لیے اس سے بڑھ کر پختہ اور کون سی بنیاد ہو سکتی ہے؟ اور گو اب فکر معاش نے گوربخش کو مجھ سے جدا کر کے لاہور سے دور کشمیر کے ایک غیر دلچسپ گوشے میں پھینک دیا ہے پھر بھی یہ معاشی و جغرافی مجبوریاں ہماری دلی رفاقت پر اثر انداز نہیں ہو سکتیں۔ وہ رفاقت جوں کی توں قائم ہے

گوربخش میرپور میں مرومی پٹرول کی ایجنسی کا مالک ہے۔ کئی بار اس نے مجھے میرپور آنے کو لکھا ہے لیکن ہر بار مختلف وجوہ سے میں میرپور نہیں جا سکا اور اب میں تار ہاتھ میں لیے یہ سوچ رہا تھا کہ مجھے گوربخش کی شادی پر جانا چاہیے یا نہیں۔ آخر گوربخش دوست ہے اور دوست کی شادی یا موت ہر روز نہیں ہوا کرتی لیکن ۔۔۔ تصویر کا دوسرا پہلو شملہ ہے اور کاظمی کی کوٹھی بھی خالی ہے۔ شملے اور میرپور میں نہ ہی فرق ہے جنرل بانگسے کی شفق اور مشن کالج کی لائبریری میں ہے اور پھر یہ تو صاف ظاہر ہے کہ اگر میں میرپور چلا جاؤں تو پھر شملے نہیں جا سکتا۔ بالفاظ دیگر اگر میں پہلے شملے چلا جاؤں تو گوربخش کی شادی دیکھنے سے رہ جاتی ہے اور اگر کہیں میرپور چلا جاؤں تو کاظمی کی کوٹھی خالی پڑی رہ جاتی۔۔۔

اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے جانے یا نہ جانے کے فیصلہ کے لیے ٹاس ہی کرنا پڑا۔ ایک پیسہ چہرہ شاہی کو اوپر اُچھال کر ہوا میں پھینک کر اور چہرہ شاہی کو شادی کا عنوان سمجھ کر میں تماشہ دیکھ رہا۔ دو منٹ سے کچھ بعد پیسہ زمین پر تھا اور چہرہ شاہی میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

بہت اچھا شملہ نہ سہی میرپور ہی سہی تجھے ڈھونڈھ ہی لیں گے کہیں نہ کہیں۔

رات کو ساڑھے نو بجے کی گاڑی پر سوار ہوا اور دوسرے دن صبح میرپور پہنچ گیا۔ میرپور ایک چھوٹا سا شہر ریاست کشمیر کی عملداری میں ہے لیکن اگر یہ کشمیر کے بجائے راجپوتانے کے ریگستان میں ہوتا تو زیادہ موزوں رہتا۔ وہی گرم خشک آب و ہوا، تمازتِ آفتاب سے جلی ہوئی پہاڑیاں، پھیکے بے مزہ کنوئیں۔ یہ بھلا گوربخش کو کیا سوجھی۔ یہاں آکر پڑ رہنے کی رغبت تو لی ہی تھی اب کیا ایک صحرائی دلہن ہی سے عمر بھر کا پیمان باندھنا تھا۔

رات کو پہاڑی گیتوں اور ڈھولک کی پرشور آواز کے درمیان جب میں نے گوربخش سے اچانک یہی سوال کیا تو اس نے کچھ توقف کے بعد مسکرا کر کہا: "یہ سب کمبخت دل کا قصور ہے۔ اسے جو چاہو سزا دے لو۔"

"خوب، تو پھر یہ لو میرج ہے کیا؟"

گوربخش مسکرا کر چپ ہو رہا۔

آنگن میں کسی لڑکی نے ایک نیا گیت شروع کیا تھا، اس کا پہلا بند مجھے یاد ہے:

اک بالی آسا دل دی
کجرک ڈھک رکھاں ماہیا، دسے آدل دی
سب پھیر دلاں دے نی ہائے   جیتوں دی کہاں نی ماسے!

شادی کے بعد یہ صلاح ٹھہری کہ گوربخش کو یہیں عدن بنانے کا موقع ہرگز نہ دیا جائے بلکہ چار پانچ دوستوں کی ٹولی میں اسے بھی شامل کر کے خوب ادھر ادھر سیر کی جائے۔

جگدیش نے اپنی عینک صاف کرتے ہوئے کہا: "کدھر کی سیر ہوگی؟"

اوتار سنگھ نے اپنے نیلے، نازک لبوں پر زبان پھیر کر کہا "ان جلی بھنی پہاڑیوں میں کیا خاک دھرا ہے؟"

چاچو نے چہک کر کہا: "میں بتاؤں، چلو سرینگر تک ہو آئیں۔ پیدل چلنا ہوگا۔ خوب لطف رہے گا۔"

ایک لمحے، بس صرف ایک لمحے کے لیے ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر ہم سب خوشی سے تالی بجا کر بول اُٹھے:

"واہ، واہ۔ کیا اچھی تجویز ہے۔" "بھئی کیا خوب۔" "واللہ تمہیں کیا خوب سوجھی۔"

قربان علی نے گوربخش کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا "اب کیا ارادہ ہے تمہارا اس بارے میں؟"

گوربخش نے مری ہوئی آواز میں کہا "میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

اس پر پھر ایک زبردست قہقہہ ہوا۔

میرپور سے چلے تو تیسرے دن کوٹلی آئے۔ کوٹلی پہنچ کر میرپور کے جلے ہوئے سیاہ ٹیلے سرسبز پہاڑیوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں، ہوا میں ایک جاں بخش خنکی سی محسوس ہوتی ہے اور پھیکے، بدذائقہ کنوؤں کے پانی کے بجائے قدرتی چشموں کا آبِ شیریں ملتا ہے۔ یہاں پہنچ کر پچھلے سفر کی سب کلفتیں دور ہو گئیں۔

ایک دن آرام کرنے کے بعد کوٹلی سے چل کر سہرہ پہنچے جو کوٹلی سے پندرہ میل کے فاصلے پر ہے۔ سہرہ سے ریاست پونچھ کی عملداری شروع ہوتی ہے۔ اس کا پہلا ثبوت جو ہمیں ملا وہ پونچھ کسٹمز ہاؤس تھا۔ جو سڑک کے کنارے کشمیر کسٹمز

منحق تھا۔ چونکہ دونوں جگہ محصول ادا کرنا پڑتا تھا لہٰذا ہم نے دونوں جگہ محصول ادا کرنے سے انکار کر دیا۔

کشمیر کا انسپکٹر کسٹمز نے نہایت شریفانہ لہجے میں کہا: "آپ کے پاس چند اشیاء تو ضرور ایسی ہوں گی جن پہ ہمیں مجبوراً محصول لینا ہو گا۔"

قربان علی نے ڈپٹ کر پوچھا: "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

پونچھ کے نوجوان و شکیل محالدار نے منہ بناتے ہوئے ایک نرالے انداز میں کہا: "تو صاحب آپ کے پاس قابل محصول کون سی اشیاء ہیں؟"

قربان علی نے بھی اسی طرح منہ بناتے ہوئے اپنے انداز میں کہا: "استغفر اللہ! میں قربان جاؤں۔ صاحب! ہمیں تو آپ کے سر کی قسم جو ہمارے پاس کوئی ایسی شے ہو۔ آپ کے سر کی قسم، آپ کے حسن صبیح کی قسم، آپ کے . . ."

حسین محالدار نے ڈانٹ کر کہا: "چپ رہو جی۔"

اس مزاح کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا سب سامان کھول کھول کر اچھی طرح دیکھا گیا۔ بستر، خیمہ، چوبداری، برتنوں کی بوریاں۔ ایک ایک چیز کو بغور دیکھا گیا۔ آخر کار بڑی کاوش تجسس کے بعد محالدار صاحب کو ایک بستر میں لپٹا ہوا ایک پیچ دار ٹیبل گراموفون ملا اور ڈھکن۔

محالدار صاحب نے آخری چیز کو چھو کر پوچھا: "یہ سارنگی ہے؟"

قربان علی نے نہایت شیریں لہجے میں جواب دیا: "نہیں، ڈمرو۔"

پونچھ کے محالدار صاحب نے غصے سے لال پیلے ہوتے ہوئے کہا: "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں! اگر آپ گالیاں دینے پر اتر آئے ہیں تو مجھے بھی مجبوراً آپ کو پولیس کے حوالے کرنا

پڑے گا۔"

"میں کہتا ہوں" قربان نے تیز ہو کر کہا "یہ (دائن کو ہاتھ لگا کر) دلربا ہے۔ آپ نہیں، بخدا۔ آپ کو اپنی ذات سے کس قدر حسنِ ظن ہے۔ یہ ساز ہے جسے آپ اپنی دانست میں سارنگی سمجھ بیٹھے ہیں۔ اس کا نام دلربا ہے۔ سمجھے آپ؟ اب آپ شوق سے پولیس کو بلائیے اور میں کسی پاگل خانے کے ڈاکٹر کو بلاتا ہوں" یہ کہہ کر قربان اِدھر اُدھر دیکھنے لگا گویا کسی پاگل خانے کے ڈاکٹر کو ڈھونڈ رہا ہو۔ ہم سب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

کسٹم آفیسر صاحب جھینپے تو بہت مگر تھے آخر کسٹم کے افسر جھٹ بات کا رخ بدل کر گراموفون کی طرف اشارہ کر کے بولے "اور صاحب، یہ کیا ہے؟"

جگدیش نے گراموفون کو آگے بڑھا کر کہا "جناب یہ ٹائپ رائٹر نہیں ہے بلکہ پورٹیبل گراموفون ہے کولمبیا کمپنی کا بنا ہوا۔ اس کے اندر ایک درجن ریکارڈ بھی بند ہیں۔ اگر جان کی امان پاؤں تو ابھی چند ریکارڈ آپ کے سامنے بجاؤں۔ بعض ریکارڈ تو بہت ہی دلکش ہیں خاص کر مس دلاری کا وہ گیت آدر گیت:

رات دن چونگی میں بیٹھا رہتا ہے
اپنے پہلو میں دبائے دردِ دل

تحصیلدار صاحب آخر انسان تھے، ہنس پڑے، اور ایک دفعہ جو ہنسے تو پھر خوب کھل کر ہنسے۔ ہمارے اور ان کے قہقہوں نے پہنچ کسٹم ہاؤس کے کونے کونے کو بہجت سے لبریز کر دیا۔ اب چونگی کا ہر فرد بشر شاداں و فرحاں نظر آ رہا تھا اور تو اور کشمیری انسپکٹر صاحب بھی اپنا کام چھوڑ ہمارے قہقہوں میں شریک ہو گئے اور اس طرح سب غم و غصہ گرد و غبار کی طرح دلوں سے دھل گیا۔ چنانچہ شام کو کشمیری انسپکٹر صاحب نے

ہمیں چائے پلائی۔ وہ چائے جو صرف اہلِ کشمیر ہی بنانا جانتے ہیں اور رات کو ہم نے پونچھی معالدار صاحب اور کشمیری انسپکٹر صاحب دونوں کو شریکِ طعام کیا۔ خاصی رات گئے تک گپ شپ اڑاتے رہے۔ دلربا جی اور جگدیش نے "دردِ دل" کو کئی چھ سات بار بجایا۔ خوب لطف رہا۔

دوسرے دن سہرہ سے ہو چلے تو شام کو شہر پونچھ پہنچ گئے۔ ابھی ہم شہر سے چار پانچ میل کے فاصلے پر تھے کہ ہمیں ریاست پونچھ کا یہ چھوٹا سا خوبصورت تخت خوشنما باغات سے گھرا ہوا نظر آیا۔ سامنے سرسبز اور اونچے پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک حسین وادی تھی جس کے بیچوں بیچ دریائے پونچھ کا نیلا پانی پتھروں پر شور مچاتا ہوا گزر رہا تھا۔ دور تک دھان کے وسیع کھیت پانی سے لبالب بھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ مرغابیوں کے خوشنما پرہوا کے دوش پر پھیلے ہوئے تھے اور غروبِ آفتاب کی ارغوانی کرنوں میں پونچھ کا تاریخی قلعہ ایک اونچے ٹیلے پر شہر کی باقی سب عمارات سے اُوپر اٹھا ہوا ایک تراشے ہوئے ہیرے کی طرح چمک رہا تھا۔

میں نے آہستہ سے کہا "نہایت حسین منظر ہے۔"

اوتار سنگھ کے نازک لب کانپے جس طرح پھول کی پتیاں ہوا میں کانپتی ہیں مگر وہ کچھ نہ بول سکا۔ ہم چلتے چلتے "صمٌ بکمٌ" ہو کر کھڑے ہو گئے۔ قدرت کے غیر فانی مصور نے اپنی آرٹ گیلری کی بے پناہ وسعتوں میں سے ایک تصویر ہمارے سامنے پیش کر دی تھی جس نے ہمیں مسحور کر دیا۔

کتنی ہی دیر اسی طرح کھڑے رہنے کے بعد وہاں سے چلے، آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے، منظر کو دیکھتے ہوئے اور اپنے دلوں میں انسان کی کم مائیگی و بیچارگی کا

احساس ہونے لگے۔ رفتہ رفتہ سڑک اب ڈھلوان ہوتی جا رہی تھی اور نیچے اترتی ہوئی بل کھاتی ہوئی وادی کی طرف چلی گئی تھی۔ آہستہ آہستہ ہم ایک نالے کے قریب پہنچے جس پر نیلے پتھروں کا ایک چھوٹا سا پل بنا ہوا تھا۔ پل کے پار چنار کے دو درخت کھڑے تھے۔ اب شہر بالکل نزدیک آ گیا تھا۔ چھوٹا سا خوبصورت شہر جو سامنے بہتے ہوئے دریا کے باہر واقع تھا۔ شفق کی ارغوانی روشنی رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں گم ہو گئی تھی اور شہر کی کھلی ہوئی کھڑکیوں اور درختوں کی پھیلی ہوئی ٹہنیوں میں بجلی کے قمقمے ٹمٹماتے ہوئے ستاروں کی طرح چمک رہے تھے۔

آہستہ آہستہ ہم دریا پر آ پہنچے۔ دو شکستہ برجوں کے درمیان، دو آہنی رسوں کے سہارے ایک لکڑی کا پل لٹک رہا تھا جو ہمارے قدم پڑتے ہی ڈولنے لگا۔

جب ہم پل کے درمیان پہنچے تو یہ حالت تھی کہ پل کسی ڈوبتی ہوئی کشتی کی طرح ڈانواں ڈول ہو رہا تھا اور ہم بدمست شرابیوں کی طرح لڑکھڑا رہے تھے۔ ہچکولوں پر ہچکولے آ رہے تھے اور شاید نیچے بہتے ہوئے دریا کی پرشور لہریں ابھر ابھر کر پیاری پیاری لوریاں سنا رہی تھیں۔ گوونمش کو یہ ترنگ آئی تو پل کے درمیان کھڑا ہو کر گانے لگا، دیس منگل کا دلکش گیت:

جھولنا جھلا ڈوری جھولنا جھلاؤ
امبوا کی ڈالی پہ کوئل بولے کوئل بولے
کوک کوک جیا ڈرے جھولنا جھلا ڈوری

رات کا وقت، دو جان فروز نغمہ، دریا کی پرشور لہریں، پل کا جھولنا۔ اس

وقت کی یاد مدتوں ہمارے دل میں رہے گی۔

شہر پونچھ کی آبادی تقریباً دس ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ یہ ریاست پونچھ کا صدر مقام ہے۔ اس کا اصلی نام "پرنتس" تھا۔ راجہ پرنتس کے نام پر رکھا گیا۔ بعد میں بگڑ کر پونچھ رہ گیا اور اب اسی نام سے مشہور ہے۔ تاریخی حیثیت سے بھی وادیٔ پونچھ کافی اہمیت رکھتی ہے۔ ہیون سانگ مشہور چینی سیاح کے سفر نامے میں بھی اس کا تذکرہ ہے۔ ہیون سانگ نے خاص کر وادیٔ سہرن کے مضبوط قلعوں کی بہت تعریف کی ہے۔ یہ وادی شہر پونچھ سے دس میل کے فاصلے پر ہے لیکن اب ان قلعوں کا نام و نشان بھی مشکل سے ملتا ہے۔ صرف کہیں کہیں چند کھنڈر باقی ہیں جو اپنی گزشتہ عظمت کی یاد میں سرنگوں ہیں۔ مغلوں کے عہد میں شاہانِ مغلیہ خصوصاً جہانگیر بادشاہ اسی راستے سے کشمیر جایا کرتے تھے۔ مابعد سکھوں کے عروج کے وقت بھی یہ خطہ کافی مشہور رہا چنانچہ سکھوں کے کئی بزرگ: بھائی میلا سنگھ، رو چا سنگھ اور بندہ بیراگی اسی خاک کی پیداوار ہیں۔

شہر پونچھ کا قلعہ قابلِ دید عمارت ہے۔ یہ مغلوں اور راجپوتوں کے زمانے کی یادگار ہے۔ یہ شہر کے جنوب مغرب میں دریا کے قریب ایک اونچی جگہ پر بنا ہوا ہے قلعہ کا عقبی منظر بہت شاندار ہے لیکن اس کا شرقی حصہ جو حال ہی میں گرا کر دوبارہ تعمیر کیا گیا ہے چنداں دیدہ زیب نہیں اور اس کی ظاہری ٹیپ ٹاپ باقی حصوں کی کہنگی و پختگی کے مقابلہ میں ایک نہایت بھونڈا مذاق پیش کرتی ہے۔

قلعے کے قریب ہی فوارہ باغ ہے جو نشاط باغ سرینگر کا ایک ہلکا سا نقشہ چربہ ہے۔ اس باغ کی ڈیوڑھی ایک اونچی محراب دار عمارت ہے جس پر جا بجا ہندو

دیویوں اور دیوتاؤں کے رنگین بت بنے ہیں۔ ڈیوڑھی کے اندر داخل ہوتے ہی فوارہ باغ کی وسیع درمیانی روش نظر آتی ہے جس پر بجری بچھی ہے اور جس کے دو رویہ بلند و بالا سرو کے درخت کھڑے ہیں۔ یہ روش باغ کو ٹھیک دو حصوں میں تقسیم کرتی ہوئی زنانہ پارک کی طرف جاتی ہے جو باغ کی زیریں منزل میں جنوب کی طرف واقع ہے۔ بالائی منزل میں ٹینس کورٹ اور حکام اعلیٰ کا کلب ہے۔ یہ باغ بہت وسیع و پر فضا ہے۔ شام کو لوگ باگ اکثر سیر کرنے کے لیے یہاں آتے ہیں اور آلو، ناشپاتی وغیرہ کے درختوں کے نیچے گھاس کے سبز مخملیں بچھونوں پر، سگندھ راج اور گلاب کی مہکتی ہوئی عطر بیز ٹہنیوں کے قریب، پانی اچھالتے ہوئے فواروں کے پاس بیٹھ کر قدرت کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ رانی صاحبہ اشیلیا کا خوشنما قصر اور موجودہ والیٔ ریاست کا موتی محل بھی قابلِ دید عمارات ہیں۔ موتی محل تو مغربی طرزِ تعمیر کا مظہر ہے۔ یہ انگریزی دیہاتی طرز پر بنا ہوا ہے اور نارمن اور گاتھک طرزِ تعمیر کا حسین امتزاج ہے۔

پونچھ میں ہم تین روز رہے اور خوب سیر کی۔ یہ صاف ستھرا بانکا شہر ہے۔ گلیاں عموماً پکی ہیں اور گندے پانی کے نکاس کا بھی اچھا انتظام ہے۔ ہم یہ مقامی دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

چاچو نے خواہش ظاہر کی: "کاش ساری دنیا بھی ایسا ہی صاف ستھرا شہر بن جائے۔"

اوتار سنگھ نے کہا: "تمہاری خواہش بالکل فضول ہے اور نہ صرف فضول اور نکمّی ہی ہے بلکہ اس سے نقضِ امن کا بھی اندیشہ ہے اور ایک عالمگیر جنگ چھڑ جانے کا احتمال ہے۔"

چاچو بے چارہ حیران ہو گیا۔ کہنے لگا: "وہ کیسے؟"

اوتار سنگھ نے جواب دیا: "نہایت سیدھی بات ہے۔ اگر خدانخواستہ سری نگر صاف ستھرا شہر بن جائے تو پھر بیچارا سوئٹزرلینڈ کون جائے اور اگر سوئٹزرلینڈ کوئی نہ جائے تو پھر سوئٹزرلینڈ کہاں سے کھائے اور سری نگر کے مقبول عام ہونے پر کیوں نہ ہندوستان اور سوئٹزرلینڈ میں جنگ چھڑ جائے؟ ٹھیک ہے؟ کیا تم نے مغربی اقوام کی تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا ہے؟"

جگدیش نے مسکراتے ہوئے کہا: "کیا داہیات بات ہے؟ اور پھر بفرض محال اگر یہ سب کچھ سچ بھی ہو تو پھر بھی جنگ کا چھڑنا ناممکن ہے۔ کیا تم نے آج کا اخبار نہیں پڑھا؟"

گوربخش نے اچانک چلا کر کہا: "اخبار؟ اخبار؟ ارے آج کا اخبار کدھر ہے؟ میں نے آج صبح ہی اس میں ایک منحوس خبر پڑھی ہے۔"

قربان علی نے جماہی لے کر پوچھا: "کیا ہوا؟ کیا مسولینی نے خودکشی کر لی؟"

گوربخش نے جلدی سے کہا: "نہیں یہ بات نہیں ہے۔ تم کتنے گدھے ہو۔"

سُکھ چین نے نہایت سنجیدہ لہجہ میں کہا: "تمہارے سمیت سات!"

ہم سب قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

گوربخش غصے سے لال پیلا ہو کر بولا: "اب تو تم ہنستے ہو، لیکن ذرا آج کا اخبار تو اچھی طرح دیکھ لو۔ سری نگر میں ہیضہ پھیل گیا ہے۔ اُسنا تم نے؟ اب خوب ہنسو ہی ہی ہی!"

ہم سب نے چلا کر کہا: "ارے ہیضہ!"

جگدیش نے خیمے کے ایک کونے سے اخبار اٹھایا، ریاست جموں و کشمیر کا کالم پڑھا گیا، واقعی سری نگر میں وبائی ہیضہ پھیل گیا تھا۔ سیاح واپس جا رہے تھے۔

گوربخش نے تجویز پیش کی: "میرے خیال میں اب سری نگر جانے کا خیال دل سے

نکال دینا چاہیئے۔"

قربان نے کانپ کر قرار داد کی ان الفاظ میں تائید کی: "بالکل درست ہے چارہ گوربخش ابھی ابھی "کنوارے" سے "بیاہا" بنا ہے اس کی امیدوں کا خون نہ کیا جائے۔"

سکھ چین نے زوردار الفاظ میں کہا: "اور میں بیچنے کی موت نہیں مرنا چاہتا۔ یہ کچھ خلافِ تہذیب سی موت ہے۔"

چاچو نے تجویز پیش کی: "تو بہتر یہ ہوگا کہ اگر ہم سری نگر نہیں جا سکتے تو ذرا بہرام گلہ تک ہی ہو آئیں۔ کافی ٹھنڈی جگہ ہے۔ سطحِ بحر سے کوئی نو ہزار فٹ بلند، دونہ مشہور تاریخی مقام ہے۔ کیوں؟" یہ کہہ کر چاچو ہم سب کی طرف فاتحانہ انداز سے دیکھنے لگا۔ گویا کہہ رہا تھا: "دیکھا! ایسی نادر تجویز سوائے میرے اور کسی کے دماغ میں نہ آسکتی تھی۔"

سب نے اس معقول تجویز پر صاد کیا اور ہم دوسرے روز بہرام گلہ کو روانہ ہوگئے۔

اس دن میلے کچیلے بادل آسمان پر چھائے ہوئے تھے۔ ہم نے احتیاطاً دو اچھے مضبوط مزدور اپنے ہمراہ لے لیے تاکہ راستے میں آنے والے طوفانی نالوں کو عبور کرنے میں مدد دے سکیں۔ ابھی ہم کوئی دو کوس ہی گئے ہوں گے کہ بوندا باندی شروع ہوگئی، زور کا جھکڑ چلنے لگا مطلع تاریک ہوگیا اور پھر چند لمحوں میں کالی کالی گھٹاؤں نے بے طرح برسنا شروع کر دیا۔ راستے میں جگہ جگہ پھسلن تھی اور جگدیش کی پشاوری چپل جس کی وہ تمام راستے میں تعریفیں کرتا آیا تھا، اب یہاں اسے بار بار دھوکا دے جاتی تھی اور وہ بیچارا اکثر جگہ دھڑام سے گر پڑتا تھا۔ پہلی بار جب وہ گرا تو ہم سب نے لمبا سا منہ بنا کر اس حادثے پر افسوس ظاہر کیا لیکن جب "رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج"۔ اب جب کہ جگدیش بار بار گرنے لگا تو یہ افسوس جلد ہی قہقہوں میں بدل گیا

اور اب یہ حالت تھی کہ ہر روز فرلانگ چل لینے کے بعد ہم جگدیش کے گرنے کے منتظر رہتے اور کوئی تنگ سی پگڈنڈی سبز سبز دھان کے کھیتوں میں سے گزرتی ہوئی نظر آجاتی تو ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہتا کیونکہ ہم جانتے تھے کہ جگدیش کی پشاوری چپل جس کی وہ راستے بھر میں تعریفیں کرتا آیا تھا، یہاں ان پانی سے بھرے ہوئے دھان کے کھیتوں میں ضرور راوندھا کر دے گی اور پھر کبھی ایسا ہوتا کہ جگدیش گرتے گرتے بچا جو، موہن لال، افتاں و خیزاں یا جو کوئی بھی اس کے آگے یا پیچھے چل رہا ہوتا اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرتا اور اس طرح اُسے بھی اپنے ہی ساتھ پانی میں دھکیل لے جاتا۔ غرضیکہ اسی طرح کیچڑ میں لت پت، بارش میں بھیگتے ہوئے، گیلے گیلے، مٹی اوڑھے ہوئے گرتے پڑتے، گرتے ہوئے تین روز سفر کرتے رہے۔ راستے دشوار گزار تھے؛ تنگ اور ٹیڑھی پگڈنڈیاں، دشوار گزار گھاٹیاں، طوفانی نالے، کئی جگہ تو راستہ ملتا ہی نہ تھا اور پھر طرہ یہ کہ بلا کی موسلا دھار بارش تھی اور آسمان کسی غریب کی ٹوٹی ہوئی چھت کی طرح ٹپک رہا تھا۔ ان تین دنوں میں ہم نے چھانگلہ، سوسران، قصبانہ تین جگہوں پہ مقام کیا لیکن اف! کس بلا کی سردی تھی۔ بجلی کی چمک، بادل کی گرج، برفانی ہواؤں کے فراٹے، دریائے پونچھ کی پُرشور روانیاں اور گیلے بستر۔ ایسا معلوم ہوتا کہ یہ جولائی کا مہینہ نہیں بلکہ دسمبر کا یخ بستہ موسم ہے۔

خدا خدا کر کے چوتھے دن آفتاب نے بادلوں سے منہ نکالا اور دھند میں لپٹے ہوئے سر بفلک پہاڑ اور سرسبز مرغزار ایک نئی شان سے پھر جلوہ افروز ہوئے۔ آبشاروں کے نیلے نیلے چشموں پر سرخی دوڑنے لگی اور گورکھنش کے خاموش ٹیلے سے سریلی تانیں نکلنا شروع ہوئیں۔ اسی دن اک حسین شام کو، جبکہ آفتاب ماڑھد کی برفانی چوٹی پہ غروب ہو رہا تھا اور

جنگل کے وحشی آنکھوں والے نڈر گڈریے ریوڑوں کو واپس گاؤں کی طرف لا رہے تھے۔ ہم مغلوں کے پرانے عشرت کدے بہرام گلہ میں داخل ہوئے۔

"گلہ" پہاڑی زبان میں "ایک تنگ راستے" کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ بہرام گلہ چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس کے جنوب مشرق میں ایک پہاڑ کو کاٹ کر وہ راستہ بنایا گیا تھا جس راستے سے شاہانِ مغلیہ کشمیر جایا کرتے تھے۔ اس کو بہرام نام انجینئر نے تعمیر کیا تھا اور اب یہ اسی انجینئر کے نام پر بہرام گلہ کہلاتا ہے۔ اس راستے کا اب محض نشان ہی موجود ہے۔ مغلوں کے زمانے کی شاہراہ اب ایک پگڈنڈی رہ گئی ہے جس پر اب کبھی کبھی بھینسیں چراتے ہوئے گوالے یا کوئی اکا دکا مسافر نظر آ جاتا ہے۔ جس پہاڑ کو کاٹ کر یہ راستہ بنایا گیا تھا اس کے دامن میں ایک طوفانی نالہ بہتا ہے جس کا نیلا برف کی طرح ٹھنڈا پانی کا غان سے آتا ہے۔ کبھی اس کا غان کے نالے پر ایک مستحکم پل تھا آج اس کی جگہ چند لکڑی کے ناتراشیدہ کندوں نے لے لی ہے جو پہلی برساتی بارش میں بہہ جاتے ہیں۔

بہرام گلہ ایک تنگ گھٹی ہوئی جگہ پر واقع ہے جو کاغان اور چنہدی مرٹہ کے نالوں کے درمیان ایک اونچی ٹیکری پر واقع ہے۔ اس کے شمال مشرق میں چنہدی مرٹھہ کی جانب سلسلۂ کوہ بہت اونچا ہو گیا ہے اور متواتر برف و باراں سے بے ریش و بروت ہے۔ سنگلاخ زمین، اونچی چٹانیں، قوی ہیکل دیوؤں کی طرح سر اٹھائے ہوئے ہیں جن پر انسان کا قدم رکھنا ہر لحظہ اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا ہے اور پھر یہاں سانپوں کی وہ بہتات ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ سینکڑوں ہزاروں سانپ، ہر چٹان کے نیچے سانپ، ہر چٹان کے اوپر سانپ، دھوپ سینکتے ہوئے، بل کھاتے ہوئے، پھنکارتے ہوئے۔ ایک عجیب ہیبتناک نظارہ ہوتا ہے۔

بس یہاں ان ننگے، اونچے، برفانی سنگلاخ پہاڑوں پر صرف تین جانور پائے جاتے ہیں

ایک تو یہی اشرف المخلوقات انسان ہے جو موسم گرما میں یہاں کبھی کبھی نظر آجاتا ہے، بندوق اٹھائے ہوئے، گھٹنوں تک چرمی موزے پہنے ہوئے شکار کی تلاش میں سرگرداں۔ دوسرا جاندار یہی سانپ ہے جو اس اشرف المخلوقات کا ازلی دشمن ہے اور تیسرا جاندار ایک چوپایہ ہے اس کا نام "مارخور" ہے کیونکہ یہ سانپ کھاتا ہے۔ مارخور ایک نایاب جانور ہے اور یہ چوپایہ ہمیشہ ان سرد، برفانی، دشوار گزار چٹانوں پر اپنا بسیرا کرتا ہے۔ یہ نہایت مضبوط، جفاکش، پھرتیلا جانور ہے۔ اس کے سر کی ہڈی اور سینگ نہایت مضبوط ہوتے ہیں اور اکثر اُسے سر کے بل سو فٹ تک چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔

مارخور کا شکار نہایت جان جوکھوں کا کام ہے۔ آج سے صدیوں پہلے ایک ایسے ہی شکار کو دیکھتے ہوئے ایک مغل بادشاہ کی جان گئی تھی۔ اس دن مارخوروں کا شکار ہو رہا تھا اور دوپہر کے بعد چٹانوں کے بڑھتے ہوئے سایوں میں جہانگیر بادشاہ، دلی کا لاابالی شہزادہ سلیم نہیں بلکہ بوڑھا جہانگیر ایک مچان پر بیٹھا ہوا مارخوروں کا شکار دیکھ رہا تھا۔ سامنے ایک شکاری بہت دیر سے ایک مارخور کے تعاقب میں تھا۔ کبھی چٹانوں کے اوپر بہزار دقت قدم رکھتا ہوا، کبھی چٹانوں کی اوٹ میں چھپتا ہوا، سانپوں سے ڈرتا ہوا، پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا لیکن نہایت ہوشیاری سے، چالاکی سے، پھرتی سے وہ ہر لحظہ اپنے شکار کے قریب آرہا تھا اور کس دلچسپی سے، انہماک و شوق سے جہانگیر گردن بڑھائے ہوئے، لب کھولے ہوئے، اس انتظار میں تھا کہ کب شکاری شکار پر جھپٹتا ہے کہ اتنے میں دفعتہً شکاری ایک اونچی چٹان سے پھسلا۔ اس کے دونوں ہاتھ بے اختیار اوپر اُٹھ گئے، فاتحانہ نگاہوں میں موت کی تاریکی دوڑ گئی، منہ سے ایک دل خراش چیخ نکلی اور دوسرے لمحے شکاری چار سو فٹ نیچے ایک چٹان پر گرا اور گرتے ہی پاش پاش ہو گیا۔

جہانگیر کے دل پر ایسی ناقابلِ برداشت چوٹ لگی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ اس کا دل دھڑک کر منہ میں آگیا ہے۔ جہانگیر نے ہاتھ کے اشارے سے کھیل کو بند کرنے کا حکم دیا کو اسی صدمے سے اسے بخار ہو گیا۔ شاہی حکما نے بہترا علاج کیا لیکن موت کا علاج اُن کے پاس نہ تھا چنانچہ پانچ چھ روز بخار میں مبتلا رہنے کے بعد مغلیہ خاندان کا یہ روشن ستارہ ٹوٹ کر فضائے بسیط میں گم ہو گیا۔ وہ لاؤ لشکر، وہ گہما گہمی، وہ نواب، امیر زادے، عربی گھوڑے خواجہ سرا، حسین کنیزیں، راجپوت جرنیل۔ کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی صرف ملکہ نور جہاں اور تین چار معتبر افراد اس حادثے سے باخبر تھے۔ مشہور کر دیا گیا کہ بادشاہ کی طبیعت بدستور ناساز ہے۔ اسی حالت میں زیرک ملکہ لبوں پہ مسکراہٹ مگر دل میں خون کے آنسو روتی ہوئی لاہور پہنچی۔ آگے جو کچھ ہوا وہ سب دنیا جانتی ہے۔

بہرام گلہ میں ہم سات روز رہے لیکن کبھی بھول کر بھی چنگڑی مرٹھ کے خونیں پہاڑ پر نہ گئے۔ ہاں ہم چنگڑی مرٹھ کے چھوٹے سے قصبے میں پرانی مغلیہ سرائے دیکھنے ضرور گئے۔ وہ کسی زمانے میں نہایت شاندار سرائے ہو گی لیکن جب ہم نے اسے دیکھا تو بالکل خستہ حالت میں تھی۔ جن کمروں میں کبھی نواب اور راجے آکر اترا کرتے تھے وہاں آج بیل دوڑ رہے تھے اور زمانے کے انقلاب پہ زبانِ حال سے "زندہ باد" کے نعرے بلند کرتے تھے۔ اکثر کمروں پر پہاڑی لوگوں نے قبضہ جما رکھا تھا اور گھر بنا کر رہتے تھے چنانچہ جن اصطبلوں میں کبھی عربی گھوڑے ہنہناتے تھے وہاں آج بھینسیں جگالی کر رہی تھیں اور چھتوں اور منڈیروں پر اُگی ہوئی گھاس نہایت مؤثر لہجے میں محکمۂ آثارِ قدیمہ کو دعوتِ عمل دے رہی تھی۔ یہاں کے لوگ نہایت غریب، شکیل اور جفاکش ہیں۔ صرف موسمِ گرما میں یہاں رہتے

ہیں اور اپنی زمینوں میں کاشت کرتے ہیں۔ یہاں سال بھر میں صرف ایک فصل ہوتی ہے۔ موسم سرما میں یہ لوگ بال بچوں سمیت نیچے گرم علاقوں میں اُتر جاتے ہیں اور مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ تاریخ کا اثر دیکھیے، صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ان لوگوں میں "نورجہاں" اور "جہانگیر" نام رکھنے والوں کی کثرت ہے۔ ہر گھر میں کم از کم ایک "نورجہاں" اور ایک "جہانگیر" ضرور موجود ہے۔ کئی بار مرکب ناموں میں ان دو ہستیوں کا نام آجاتا ہے، مثلاً: نورجہاں فاطمہ، جہانگیر شیر علی خاں اور ایسے کئی عجیب عجیب نام سننے میں آتے ہیں۔ بالعموم ہر گاؤں کے نمبردار کو "جہانگیر" کہا جاتا ہے اور ہر حسین عورت نورجہاں کے نام سے پکاری جاتی ہے

چندی مڑھ کی سرائے دیکھ کر واپس آتے ہوئے ہمارے پہاڑی رہبر نے پہلا راستہ چھوڑ دیا، یعنی جس راستے سے ہم سرائے دیکھنے گئے تھے اور ایک دوسرا راستہ اختیار کیا جو ایک تنگ سی پگڈنڈی کی صورت میں ڈھلوان ہو کر آخر چندی مڑھ کے نالے میں ختم ہو جاتا تھا۔ راستے میں میں نے رہبر سے سوال کیا:

"تم اب ہمیں کدھر لے جا رہے ہو؟"

"کچھ دکھانے کے لیے!"

"وہ کیا؟ کوئی شکستہ مزار یا فرسودہ قلعہ؟"

اوتار سنگھ نے ناک چڑھا کر کہا: "تمہاری مراد شاید کسی عورت سے ہے۔ اگر ایسا ہو تو (کانوں پر ہاتھ رکھ کر) میں باز آیا۔"

قربان ہنس کر کہنے لگا: "اوتار! تمہیں کیوں نہ جنسی منافرت پھیلانے کے جرم میں کالے پانی بھیج دیا جائے۔"

اوتار سنگھ بولا: "تو کیا کالے پانی میں عورتیں نہیں ہیں۔ بخدا اگر ایسا ہو تو میں آج کوئک مارچ کرنے کو تیار ہوں۔"

ہمارا رہبر کہنے لگا: "مہاجو آپ کو کالے پانی جانے کی ضرورت نہیں۔ جو چیز میں اب آپ کو دکھانے والا ہوں وہ حقیقت میں خود بھی نہایت خوبصورت ہے اور ایک خوبصورت عورت کے نام سے وابستہ ہے۔"

اس پر ہم سب چپ ہو گئے۔

اب ہم نالے میں چل رہے تھے، کبھی پانی میں سے گزرتے ہوئے کبھی پتھروں کو پھاندتے ہوئے۔ نالے کے دونوں طرف نہایت دلآویز ہریاول تھی جو آنکھوں کو نہایت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ رنگ برنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے جن کی مہک سے ساری ہوا معطر تھی۔ سنبلو اور رس بھری کی جھاڑیاں پھلوں سے لدی پھندی تھیں۔ چلتے چلتے ہم کسی پھل دار جھاڑی کے پاس ٹھہر جاتے اور جھکی ہوئی شاخوں سے پکے ہوئے سنبلو اور سرخ سرخ رس بھریاں توڑ توڑ کر کھاتے۔ کہیں شمشاد کے نازک بوٹے کھڑے تھے تو کہیں اخروٹ کے قدآور درخت لانبے لانبے ڈال پھیلائے ہوئے سایہ کر رہے تھے اور ان پر جنگلی پرندے بیٹھے تھے۔ جنگلی طوطے، گٹر، رت سنگے اور سنہرے جن کے پر تتلیوں کی طرح رنگین تھے اور جن کی بولیاں بلبل کے نغموں کی طرح دلفریب تھیں۔ کبھی کوئی پرندہ پھڑپھڑاہٹ کرتا، قوس قزح کی طرح چمکتا ہوا سامنے سے گزر جاتا اور آنکھوں کو روشن کر جاتا۔ کبھی کوئی دہریلی کے پاس سے شاہ بلوط کا گھنا جھنڈ سا سامنے آ جاتا جس کے خوشگوار سائے میں نوجوان چرواہے اور چرواہیاں ریوڑوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے گاتے ہوتے تھے۔ الغوزے بجاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

اسی طرح چلتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے ایک دوسرے کو چھیڑتے ہوئے ایک پل کے قریب پہنچ جاتے ہیں جو کرسی کی شکل میں دو دیواروں کے درختوں کے گرد گھیرا ہوا تھا۔ یہ پل ایک تنگ موڑ پر تھا۔ اس سے آگے آنے والی جگہ ہم سے پوشیدہ ہو گئی تھی۔

ہمارے رہبر نے کہا: "یہی وہ جگہ ہے ذرا کان لگا کر سنیئے!"

ایک مدھم سا شور جیسے دو ہزار آدمیوں کے مجمع سے پیدا ہوتا ہے سنائی دیا۔

ہم اشتیاق میں جلدی سے آگے بڑھے اور تیز تیز قدموں سے موڑ کاٹ کر پل عبور کیا۔

سبحان اللہ!

کتنا خوبصورت آبشار تھا کوئی چار سو فٹ اونچا۔ پہاڑ کی چوٹی پر سے دو چٹانوں کو چیر کر نکلتا تھا اور پھر کوئی دو سو فٹ نیچے اتر کر ایک اٹھتی ہوئی چٹان کے پیچھے گم ہو جاتا تھا اور پھر اسی چٹان کے قدموں سے لاکھوں شور مچاتا ہوا نکلتا اور پتھروں پر سر ٹکراتا ہوا شور مچاتا ہوا ایک نالے کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ آبشار کے دونوں طرف جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی چٹانوں پر کہیں کہیں اونچے قد آور درخت کھڑے تھے اور پانی کے چھوٹے چھوٹے قطرے ان ٹہنیوں سے ٹپک رہے تھے۔

میں نے آہستہ سے پوچھا: "اس کا کیا نام ہے؟"

"نوری چشم" رہبر نے جواب دیا۔ (THE FALL OF LIGHT)

نوری چشم! نور جہاں!

یہاں ہوا میں خاصی خنکی تھی اور ایک عجیب سی خوشبو کچھ کچھ اوزون (OZONE) سے ملتی جلتی۔ اور گو ہم آبشار سے ڈیڑھ دو سو گز کے فاصلے پر تھے پھر بھی آبشار کی ہلکی ہلکی

پھوار ہم پر پڑ رہی تھی۔ پانی کی چھوٹی چھوٹی بوندیں لاکھوں کروڑوں اَن گنت شبنم کے
حسین قطروں کی طرح درختوں کے پتوں پر، جھاڑیوں کی جھکی ہوئی شاخوں پہ بنفشے کے تھرائے
ہوئے پھولوں پر پڑ رہی تھیں۔ آبشار کے قریب ہی، جہاں یہ نیچے چٹان میں غائب ہو رہا
تھا، ایک خوشگوار ہلکا سا دھواں اُٹھ رہا تھا اور اس کے بیچ میں ایک دلکش قوسِ قزح
تنی تھی۔ مدھم اور رنگین۔ یہ قوسِ قزح ہر لمحے ٹوٹ جاتی اور ہر لحظہ ٹوٹ کر نئی بن جاتی تھی۔
پہاڑ کی چوٹی پر سے لاکھوں ٹن پانی نیچے گر رہا تھا۔ رفتار میں نہایت تیز اور نہایت ہی آہستہ۔
ایک لمحے میں پانی بجلی کی سی سرعت کے ساتھ نیچے جاتا ہوا معلوم ہوتا اور دوسرے لمحے
میں ایسا دکھائی دیتا کہ آبشار بالکل ساکن بن کر رہ گیا ہے اور گویا آبشار نہیں محض برف کا
ایک مہیب تودہ ہے، ایک گلیشیر ہے۔ لیکن پھر فوراً ہی یہ احساس بھی زائل ہو جاتا اور
گرتے ہوئے پانی کے کروڑوں بلبلے روئی کے گالوں کی طرح سفید آبشار کی رعد کی سی آواز
اور اڑتی ہوئی اور دل سے ابھرتی ہوئی پھوار جلد ہی پہلے احساس کو برقرار کر دیتی۔

رہبر آہستہ آہستہ، گویا کسی بھولے ہوئے قصے کو دہرا رہا ہو، کہنے لگا: "وہ جو سامنے
بڑھی ہوئی چٹان آپ دیکھ رہے ہیں، وہ چٹان بالکل آبشار کے نزدیک، یہ چٹان جہانگیر بادشاہ
کے وقت میں بہت آگے بڑھی ہوئی تھی اور اس چٹان پر پتھر کی دو کرسیاں بنی ہوئی تھیں۔
ان پر جہانگیر بادشاہ اور ملکہ نورجہاں دوپہر کے بعد بیٹھا کرتے تھے۔ ادھر ادھر پہاڑیوں
پر قناتیں لگا دی جاتی تھیں۔ اس آبشار کے قدموں میں کنیزوں کے تیرنے کے لیے ایک
تالاب بنایا گیا تھا جہاں——

پتا نہیں رہبر کیا کہہ رہا تھا لیکن میری آنکھوں سے صدیوں کا پردہ ہٹ گیا تھا۔
میں اپنے سامنے ان دو کرسیوں پر بیٹھے ہوئے جوڑے کو دیکھ رہا تھا۔ ایک تھا جہانگیر

بادشاہ شہزادہ سلیم، انارکلی کا عاشق اور دوسری ہندوستان کی ملکہ نورجہاں۔ مرزا غیاث کی بیٹی، شیرافگن کی بیوی اور اب مغل بادشاہ کی چہیتی منکوحہ۔ قناتوں کے اندر آنے جانے والوں کے لیے سزائے موت تھی۔ لیکن میں تو جہانگیر بادشاہ کے قریب کھڑا سب کچھ دیکھ رہا تھا! وہ ایک جامِ ارغوانی ہاتھ میں لیے ملکہ کے قریب جھک کر کیا کہہ رہا تھا؟ اور ملکہ اُسے کیا جواب دے رہی تھی؟ کیا اسی جانفزا پھوار کے قطرے اُس ارغوانی جام میں ٹپک رہے تھے اور کیا ملکہ کی بل کھاتی ہوئی زلفیں اُسی پھوار کے موتیوں سے گندھی ہوئی تھیں؟

مگر نہیں، یہ تو محض ایک وہم تھا، سراب حقیقت! یکایک اس ارغوانی جام نے چھلک کر آبشار کی صورت اختیار کر لی۔ مغل بادشاہ اور حسین ملکہ کی تصویریں معاً نگاہوں کے سامنے سے ہٹ گئیں۔ شاید ہوا کا وہی جھونکا نہیں واپس لوٹا کر لے گیا جس نے آج ایک دم کے لیے آج سے ساڑھے تین سو سال پہلے کی تاریخ کے فرسودہ و رنگین اوراق الٹ دیے تھے۔ اب پھر آنکھوں کے سامنے وہی آبشار تھا: خوبصورت، ہیبتناک، وحشی۔ دل پر ایک عجیب احساس طاری ہو گیا۔ قدرت کی جمالی کیفیتوں کے آگے انسانی حسن کس قدر ہیچ ہے۔ اور اس کے پرہیبت شکوہ و جلال کے سامنے انسانی طاقت کس قدر پست نظر آتی ہے۔ پانی کے ان لاکھوں کروڑوں ٹوٹتے ہوئے بلبلوں میں بشریت کی مکمل تاریخ موجود تھی اور قدرت کی ابدیت کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کی کم مائیگی اور بیچارگی کا بھی اعتراف تھا۔ غالباً آج سے ہزاروں برس پہلے بھی یہی آبشار ہوگا، بالکل اسی طرح حسین، اسی طرح دلفریب۔ انسانی صدیاں اس کے چند لمحات ہیں اور انسانی مسرتوں اور غموں کے مقابلے میں اس کے پاس اپنی ابدی وحشیانہ ہنسی ہے!

پتا نہیں میں کتنی دیر وہاں بیٹھا رہا، پتا نہیں میں کتنی دیر اور وہاں بیٹھا رہتا اگر

ایک مدھم اور نحیف آواز مجھے اس روحانی خواب سے جگا نہ دیتی۔ جب میں ہوش میں آیا تو چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور آبشار کا پانی ایک نورانی سیل بن کر گر رہا تھا۔ میرے سامنے ایک بوڑھی عورت کھڑی تھی: دوہری کمر، چہرے پر لاتعداد جھریاں، روئی کی طرح سفید بال اور نحیف آواز میں کہہ رہی تھی: "بابا، ایک پیسہ، خدا کا واسطہ ایک پیسہ۔"

میں جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میرے ساتھی پرے ایک ٹیلے پر بیٹھے تھے، چپ چاپ اور راکڑ دل۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی مافوق الفطرت سحر سے مسحور ہو گئے ہیں۔ سارا منظر افسانوی اور الف لیلوی تھا۔ ایسا گمان ہوتا تھا کہ ہم انسانوں کی سرزمین میں نہیں ہیں بلکہ کسی جنوں یا پریوں کی دنیا میں آگئے ہیں لیکن اس بوڑھی عورت کی کمزور آواز نے پھر چونکا دیا۔

"بابا ایک پیسہ، خدا کے واسطے ایک پیسہ۔"

میں نے جلدی سے جیب سے ایک پیسہ نکال کر اُسے دیا۔ وہ مجھے دعائیں دینے لگی۔

میں نے آبشار کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا: "تم اُسے جانتی ہو؟"

اس نے آہستہ سے پراسرار طریق سے سر کو ایک اثباتی جنبش دی۔

"اس گا کیا نام ہے؟ تم جانتی ہو؟"

اس نے رُک رُک کر کہا: "نورمی ... چھنم ... نو ... ری ... چھنم۔"

شاید وہ کوئی بھولا بسرا واقعہ یاد کر رہی تھی۔

معاً مجھے کچھ یاد آگیا، میں نے پوچھا: "تمہارا نام کیا ہے؟"

"نور جہاں!"

یہ کہہ کر اس نے آہستہ سے سر جھکا لیا اور لکڑی ٹیکتی ہوئی آگے چل پڑی۔ چاندنی میں اس کے پریشان بال چاندی کے تاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ میں نے سوچا۔ یہ بھی موجودہ صدی کے کسی جہانگیر کی چہیتی منکوحہ ہوگی۔!

ممتا

کوئی دو بجے کا وقت تھا، بادلوں کا ایک ہلکا سا غلاف چاند کو چھپائے ہوئے تھا یکایک میری آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ساتھ کی چارپائی پر اماں سسکیاں لے رہی ہیں۔

"کیوں امی؟" میں نے گھبرا کر آنکھیں ملتے ملتے پوچھا۔

"کیوں . . . امی!" اماں نے "کیوں" اور "امی" کے درمیان میرے سوال کو غصے سے دہراتے ہوئے کہا، "شرم نہیں آتی، باپ کو بھی اور بیٹے کو بھی۔ اتنے بڑے ہو گئے ہو، کچھ خدا کا بھی خوف نہیں۔"

"آخر ہوا کیا؟" میں نے جلدی سے بات کاٹ کر پوچھا "یہ آدھی رات کے وقت رونا کیسا؟"

گرمیوں کے دن تھے۔ ہم سب برآمدے میں سو رہے تھے مگر ابا اندر سامنے ایک کمرے میں سو رہے تھے۔ ان کی طبیعت ناساز تھی اور انہیں اکثر گرمیوں میں بھی سردی لگ

جانے کا اندیشہ لاحق رہتا ہے اس لیے عموماً وہ اندر ہی سویا کرتے ہیں۔ آخر اُن کی آنکھ بھی کھل گئی۔ وہیں بستر پر سے کروٹ بدل کر بولے "کیا بات ہے وحید؟ تمہاری اماں کیوں رو رہی ہیں۔"

"میں کیا بتاؤں ابا، بس رو رہی ہیں۔"

"ہاں اور تمہیں کس بات کی فکر ہے۔" اماں کی ہچکیاں اور بھی تیز ہو گئیں "پتا نہیں میرا لال اس وقت کس حالت میں ہے۔ میرا چھوٹا محمود، اور تم یہاں پڑے آرام سے سو رہے ہو۔ وہاں اس کا کون ہے؟ نہ ماں، نہ بھائی، نہ بہن، اور تم یہاں خراٹے لے رہے ہو آرام سے، جیسے تمہیں کسی بات کی فکر ہی نہیں۔ (سسکتے ہوئے) میں نے ابھی ابھی اپنے چھوٹے محمود کو خواب میں دیکھا ہے۔ وہ ایک میلے کچیلے بستر میں پڑا بخار سے تپ رہا تھا۔ اس کا بدن تنور کی طرح گرم تھا۔ وہ کراہتے ہوئے اماں، اماں، کہہ رہا تھا۔" یہ کہہ کر اماں زور زور سے رونے لگیں۔

اماں کا "چھوٹا محمود" اور میرا بڑا بھائی لاہور بی اے میں تعلیم پا رہا تھا، عمر تقریباً بیس۔ میں ایف اے کا سالانہ امتحان دے کر لاہور سے یہاں مئی کے مہینے ہی میں آگیا تھا مگر محمود کو ابھی لاہور کی تپتی ہوئی فضاؤں میں پورا ایک ماہ اور گزارنا تھا لیکن اب جون کا مہینہ بھی گزر گیا تھا اور محمود ابھی تک لاہور سے واپس نہ آیا تھا۔ اماں بہت پریشان تھیں، اور سچ پوچھیے تو ہم سب بہت پریشان تھے۔ ہم نے اُسے پرسوں ایک تار بھی دے دیا تھا اور دو دن کے بعد اچانک کل ہی محمود کا خط آیا تھا۔ چند مختصر سی سطریں تھیں، لکھا تھا "میں بیمار ہوں۔ ملیریے کا بخار ہے لیکن اب ٹوٹ رہا ہے۔ چند دنوں سے یہاں بہت بارش ہو رہی ہے۔ اگر لاہور کا یہ حال ہے تو اسلام آباد میں کیا ہوگا۔ کیا کشمیر آنے کا راستہ کھلا ہے۔ جلدی لکھیے کہ کس راستے سے آؤں۔ کیا جموں بانہال روڈ سے آؤں کہ کوہالہ، اوڑی سڑک سے۔ کون سا راستہ بہتر رہے گا؟" ہم نے سوچ بچار کے بعد ایک اور تار دے دیا تھا کہ بارش

بہت ہورہی تھی اور دونوں سڑکیں شکستہ حالت میں تھیں پھر بھی کوہالہ اوڑی روڈ بانہال روڈ سے بہتر حالت میں تھی اس لیے یہی مناسب سمجھا کہ محمود کوہالہ روڈ ہی سے آئے۔ اب آدھی رات کے وقت یہ اُفتاد آپڑی۔

ابا کی نیند پریشان ہو گئی تھی، چیں بجبیں ہوتے ہوئے بولے "تو اس کا کیا کیا جائے؟ اور تمہیں تو یونہی دل میں وسوسے سے اُٹھا کرتے ہیں، بھلا اس کا علاج کیا ہے؟ آخر محمود کوئی بچہ تو نہیں۔ تمہیں فکر کس بات کی ہے۔ ہزاروں ماؤں کے لال لاہور پڑھتے ہیں اور ہوسٹلوں میں رہتے ہیں۔ اتنا ہی ہوگا، اگر آج صبح وہ لاہور سے چلا تو شام کو وہ راولپنڈی پہنچ گیا ہوگا، کل کوہالے اور۔۔۔۔۔"

اماں جلدی سے بولیں "اور۔۔۔ اور؟ ۔۔۔ کیا غضب کرتے ہو! اور اگر خدا نہ کرے اس کا بخار ابھی نہ ٹوٹا ہو تو پھر؟ میں پوچھتی ہوں تو پھر؟" یہ کہہ کر اماں رک گئیں اور دوپٹے سے آنسو پونچھ کر کہنے لگیں: "مجھے موٹر منگوا دو، میں ابھی لاہور جاؤں گی۔"

"اب تم سے کون بحث کرے ہمیں تو نیند آئی ہے۔" یہ کہہ کر ابا کروٹ بدل کر سو رہے۔ میں نے بھی یہی مناسب جانا کہ آنکھیں بند کر لیں مگر کانوں میں اماں کی مدہم سسکیوں کی آواز، جسے وہ دبانے کی بہت کوشش کر رہی تھیں، برابر آرہی تھی۔ کیا دل ہے ماں کا اور کتنی عجیب ہستی ہے اس کی؟ میں آنکھیں بند کیے ہوئے سوچنے لگا۔ ماں کا دل، ماں کی محبت، مامتا! کس قدر عجیب جذبہ ہے! عالمِ جذبات میں اس کی نظیر ملنی محال ہے۔ نہیں، تو یہ اپنی نظیر آپ ہے۔ ایک سپنے کے دھندلکے میں اپنے بیمار بیٹے کو دیکھتی ہے اور چونک پڑتی ہے، لرز جاتی ہے مامتا! کیا اس جذبے کی اساس محض جسمانی ہے؟ محض اس لیے کہ بیٹا ماں کے گوشت، پوست کا ایک ٹکڑا ہے؟ اور کیا ہم سچ مچ فلابیر کے تخیل کے مطابق

اس کائنات میں اکیلے ہیں تنہا، بے یار و مددگار، ایک دوسرے کو سمجھتے ہوئے بھی ناآشنا ہیں! مگر میں بھی تو محمود کا بھائی ہوں، میری رگوں میں بھی وہی خون موجزن ہے، ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اور اپنی زندگی کے ان بیس سالوں میں صرف دو دفعہ محمود سے جدا ہُوا ہوں اور وُہ بھی نہایت قلیل عرصوں کے لیے۔ پھر میں کیوں اس قدر اُس کے لیے بیتاب و بیقرار نہیں۔ مامتا! کیا ہم سچ مچ پتھروں کے تودوں کی طرح ہیں، مصر کے میناروں کی طرح خوبصورت لیکن بے جان، اشوک کے کتبوں کی طرح سبق آموز لیکن بےحس، بے روح؟ مامتا! بدھ نے کہا تھا کہ یہ دنیا دھوکا ہے، سراب ہے، مایا ہے۔ ہوگی، لیکن یقین نہیں پڑتا۔ آخر یہ حسین جذبہ کہاں سے آیا؟ اور کائنات کے ایک گوشے میں سسکتی ہوئی ماں! کیا یہ بھی ایک دھوکا ہے؟ سچ جانیے یقین نہیں پڑتا۔

چھوٹا محمود ۔ ۔ ۔ میرا ننھا محمود ۔ ۔ ۔ میرا لال!

امی ہکی ہکی ہچکیوں میں بھائی کا نام لے رہی تھیں، کتنی معمولی سی بات تھی۔ بھائی جان شاید ابھی لاہور ہی میں ہوں گے، ضیافتیں اڑاتے ہوں گے، سینما دیکھتے ہوں گے۔ یا اگر لاہور سے چلے آئے ہوں تو راولپنڈی اس وقت خواب خرگوش میں پڑے خراٹے لے رہے ہوں گے۔ ملیریا! کیا عجب ملیریے کا بخار مطلق ہی نہ ہو۔ میں بھائی جان کے بہانوں کو خوب جانتا ہوں، اماں بھی جانتی ہیں مگر پھر بھی رو رہی ہیں۔ آخر کیوں؟ مامتا! شاید یہ کوئی روحانی قرابت ہے، شاید اس دنیا کے وسیع صحرا میں ہم اکیلے نہیں ہیں، شاید ہم محض پتھروں کے تودوں کی طرح نہیں ہیں، شاید اس انسانی مٹی میں کسی ازلی آگ کے شعلوں کی تڑپ ہے۔ مجھے موپاساں کا افسانہ "تن تنہا" یاد آگیا جس میں اس نے اس شدید احساسِ تنہائی کا رونا رویا ہے۔ آہ بیچارہ موپاساں! وہ ایک ماہرِ نفسیات تھا اور ایک ماہرِ نفسیات کی طرح وہ کئی بار نفسیاتی واردات کا صحیح اندازہ کرنے سے قاصر رہا۔ اُس کے افکار نے اُسے اکثر

غلط راستہ پر ڈال دیا" تنِ تنہا"، ایک ایسی ہی مثال ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"عورت ایک سراب ہے اور حسن ایک فروعی امر۔ ہم ایک دوسرے کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے۔ میاں بیوی سالہا سال ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے بیگانہ ہیں۔ دو دوست ملتے ہیں اور ہر دوسری ملاقات پر ایک دوسرے سے دور چلے جا رہے ہیں۔ نسوانی محبت مستقل دھوکا ہے۔ اور جب میں عورت کو دیکھتا ہوں تو مجھے چاروں طرف موت ہی موت نظر آتی ہے۔"

میں نے آنکھیں کھول کر اماں کی طرف دیکھا: امی روتے روتے سو گئی تھیں۔ گال آنسوؤں سے گیلے تھے اور بند آنکھوں کی پلکوں پر آنسو چمک رہے تھے۔ کیا امی موت ہے؟ اور کیا ممتا بھی کوئی ایسا ہی ہلاکت آفریں جذبہ ہے؟ شاید موپاساں غلطی پر تھا۔ شاید اُسے یہ لکھتے وقت اپنی شفیق ماں کی یاد نہ آئی تھی، وہ اس کی حیات بخش لوریاں، وہ نرم نرم تھپکیاں جب کہ وہ بچوں کی طرح صرف "اوں، اوں" کہہ کر بلبلا اٹھتا تھا اور اس کی چھاتی سے لپٹ جاتا تھا... نسوانی محبت مستقل دھوکا ہے... شاید اُسے اپنی اماں کے وہ طویل بوسے بھول گئے جب بڑا ہوتے پر بھی اس کا نفسیاتی سر اپنے بازوؤں میں لے لیتی تھی اور پیار کرتی تھی، جب وہ ممتا سے بے قرار ہو جاتی تھی اور اس کی غیر حاضری میں بھی اس کی راہ دیکھا کرتی تھی، اس کی ہر غلطی کو بچوں کی بھول سے تعبیر کیا کرتی تھی اور ہر گناہ کو نیکی میں تبدیل کر دیتی تھی۔ اس دنیا میں ہم اکیلے نہیں ہیں بلکہ ہمارے ساتھ ہماری مائیں ہیں۔ وہ شدید احساس تنہائی جس کی موپاساں کو شکایت ہے اور جو دنیوی کلفتوں اور الفتوں میں بھی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتا، نہ جانے وہ ماں کی گود میں آ کر کیسے ناپید ہو جاتا ہے؟ ماں کے جذبۂ محبت میں ایک ایسی دیوانگی و وارفتگی ہے جو اس کی انانیت کو فنا کر دیتی ہے اور

اس کی ذات کو بچوں میں منتقل کر دیتی ہے۔

یقیناً ہم اس دنیا میں اکیلے نہیں ہیں بلکہ ہمارے ساتھ ہماری مائیں ہیں۔۔۔ یقیناً ۔۔۔ مگر۔۔۔

غٹرغوں، غٹرغوں، ککڑوں کوں، ککڑوں کوں۔۔۔ کبوتر، مرغ، چڑیاں دوشیزۂ سحر کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ ان کی خوش الحانی نے مجھے بیدار کر دیا۔ میں اُٹھ کر بستر پہ بیٹھ گیا، ٹانگیں چارپائی سے نیچے لٹکا دیں، اور آنکھیں ملنے لگا۔ اتنے میں آنگن سے اماں کی آواز آئی:

"بیٹا وحید اٹھو، محمود آ گئے۔"

آنکھیں کھول کر دیکھا تو سچ مچ اماں آنگن میں اُگے ہوئے پپیتا کے بوٹے کے نیچے ایک مونڈھے پر بیٹھی تھیں اور محمود اُن کے پیروں پر جھکا ہوا تھا۔ میں جلدی سے اُٹھا، آنگن میں ہم دونوں بھائی بغلگیر ہوئے۔

"اتنے دن کہاں رہے؟" میں نے محمود سے پوچھا۔

محمود نے شوخ نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور ایک آنکھ میچ لی، پھر گردن موڑ کر پپیتا کے سرخ سرخ پھولوں کے گچھوں کو غور سے دیکھنے لگا۔

"کوئی ساٹھ روز جھڑی رہی، متواتر بارش ہونے سے سڑک جا بجا سے بہ گئی تھی اور سپرنٹنڈنٹ ٹرائیک نے راستہ بند کر دیا تھا۔" اس نے آہستہ سے جواب دیا اور یہ کہہ کر ایک ہاتھ سے میرے ہاتھ کو پکڑ کر زور زور سے ہلانے لگا۔

اماں کھڑی دیکھ رہی تھیں اور ہم دونوں کو دیکھی جاتی تھیں۔ ان کی آنکھیں پرنم تھیں۔ آنسوؤں کے ان دو سمندروں میں خوشیوں کی جل پریاں ناچ رہی تھیں۔

قبر

وہ کالج میں نیا نیا داخل ہوا تھا۔ پہلے شاید موگا کالج میں تعلیم پاتا تھا، پھر جب اس کا بڑا بھائی لاہور کے ایک بنک میں ملازم ہو گیا تو وہ بھی لاہور آ گیا۔ وہ بے حد شرمیلا تھا۔ چھریرے بدن کا خوبرو جوان، فراخ پیشانی، کھلتا ہوا رنگ، متبسم ہونٹ — وہ ہونٹ جو ایک شرمیلی مسکراہٹ کے باوجود ہر وقت کسی نامعلوم جذبے کے زیرِ اثر تھرتھراتے رہتے تھے۔ جماعت میں عموماً وہ پچھلے بنچوں پر بیٹھا کرتا اور ہمیشہ ایک کونے میں۔ اسے کسی نے کبھی جماعت میں کوئی شرارت کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ نہ وہ لڑکیوں پر چاک پھینکتا تھا اور نہ ہی کاغذ کے ہوائی جہاز اڑاتا اور اس نے تو کبھی فاضل پروفیسر کی عمدہ تقریر کے دوران میں ایک پیسہ تک بھی بطورِ تحسین پروفیسر کی میز پر نہ پھینکا تھا۔

اور پھر ایک دن مجھے پتا چلا کہ وہ شاعر بھی ہے۔

کالج ہوسٹل میں ہمارے کمرے ساتھ ساتھ تھے اس لیے ہم دونوں ایک دوسرے

سے بہت جلد مانوس ہو گئے تھے۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ لائل پور کا رہنے والا ہے
موضع ماموں کانجن۔ وہ سات بھائی ہیں: ایک حکیم، ایک وکیل، ایک سکول ماسٹر، ایک
آڑھتی، ایک بزاز، ایک افیون کا سرکاری ٹھیکیدار اور ساتواں اور سب سے چھوٹا وہ
خود ایک طالب علم تھا۔ چھ بھائی تو بیاہے جا چکے تھے اور ان کی بیویاں اگرچہ کافی بدصورت
تھیں مگر "جہیز" کے معاملے میں بہت "حسین" واقع ہوئی تھیں اور اب اس کی باری
تھی۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد۔

شاید اسی امر نے اسے شاعر بنا دیا تھا۔

موسم سرما کی چاندنی راتوں میں جب بادلوں کے ہلکے ہلکے ٹکڑے، پریزادوں کی طرح
آسمان میں اُدھر رہے ہوتے اور ہلکی، نرم، سپید چاندنی کا پرتو ہوسٹل کے کنگروں کو کسی پرستانی
قلعے کے میناروں کی طرح پُراسرار اور حسین بنا دیتا ہم دونوں ہوسٹلوں کی چھت پر کسی
بُرج میں جا بیٹھتے۔ میں اس سے پوچھتا:

"سچ کہنا کیا تم نے کاتن سے زیادہ خوبصورت اور پیاری لڑکی کہیں دیکھی ہے۔
خصوصاً جس دن وہ سپید ساری اور نقرئی آویزے پہن کر جماعت میں آتی ہے تو کیسی
پیاری معلوم ہوتی ہے۔ ایمان سے کہنا کیا اس وقت تمہارا دل یہ نہیں چاہتا کہ ایک
ہلکا سا چاک کا ٹکڑا اس طرح پھینکا جائے کہ اس کے کانوں کے قریب، اس کی سفید
ساری کے دلفریب و دلربا سے چھوتا ہُوا، گویا اُسے چومتا ہُوا گزر جائے اور ایک
چنبیلی کے پھول کی طرح اس کے قدموں میں جا گرے۔ ایمان سے، کلاس روم میں بیٹھے
بیٹھائے خراجِ حسن ادا کرنے کا اس سے بہتر ذریعہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ کیوں کنہیا لال!
اور پرنسپل اور پروفیسروں کی بدذوقی تو دیکھو کہ ہمیں اس قسم کی باتوں پر بھی جرمانہ

گرنے سے نہیں چوکتے اور "بدمعاش" اور "لفنگا" کے خطاب الگ بخشے جاتے ہیں
جی چاہتا ہے . . ."

کنھیا لال ایک شعر گنگنانے لگا اور پھر اس نے آہستہ آہستہ مدھم لبوں میں اپنی داستانِ محبت کہہ ڈالی۔ شرمیلی پہلی محبت جو ایک نوزائیدہ کلی کی طرح پتوں میں چھپی رہی۔ اس نے یہ داستان رُک رُک کر بیان کی۔ اس کے ہلکے، مدھم لہجے میں وہ مٹھاس اور حلاوت تھی جو اس پہاڑی گیت میں ہوتی ہے جسے جنگل کی ہواؤں نے کسی کمسن چرواہے کے نازک لبوں سے پہلی مرتبہ سنا ہو۔ اس کی آنکھوں میں شرم اور حلیمی تھی جو محبوب کی پہلی نگاہوں میں ہوتی ہے۔ داستان شروع کرنے سے پیشتر اس نے ایک بار سُوئے مشرق دیکھا کہ اس کی آنکھوں کی پتلیاں تاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔

"ہمارے گھر میں پانی بھرنے کا کام ایک بیوہ برہمنی کے سپرد ہے۔ اس کی ایک لڑکی ہے رکمن!" کنھیا لال نے رُک کر کہا، "رکمن کو تم نے نہیں دیکھا اسی لیے کاش کی دن رات تعریف کیا کرتے ہو۔ رکمن کا ایک چچا ہے جس نے رکمن کے باپ کے مرنے کے بعد اس کی تمام جائداد پر قبضہ کر لیا ہے اور لڑکی اور بیوہ برہمنی کو اس سے محروم رکھا ہے اس نے اپنے مرحوم بھائی کے مکان پر بھی قبضہ کر لیا ہے اور رکمن اور اس کی ماں کے لیے دو کوٹھڑیاں رہنے کے لیے دے دی ہیں۔ ماں بیٹی دونوں بڑی مشکل سے دن کاٹ رہی ہیں اور دو تین گھروں میں برتن مانجتی اور پانی وغیرہ بھرتی ہیں۔ ہمارے ہاں ان کا آنا جانا بہت ہے۔ وہ بیچاریاں جب ہمارے گھر آکر میری بدھ رت بھابیوں کو اپنے دکھڑے سناتی ہیں تو انہیں بہت رحم آتا ہے اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ صبح یا شام کے وقت رکمن کی ماں رکمن کے چچا کی ایذا رسانی کی ایک نئی داستان سنا رہی ہیں،

میرے چھ بڑے بھائی بھی ان کے گرد جمع ہو گئے ہیں اور رکمن کی شبنم فشاں آنکھوں کی طرف دیکھ دیکھ کر ہمدردی جتا رہے ہیں۔ ان کا روئے سخن ہمیشہ رکمن کی طرف ہے نہ کہ رکمن کی ماں کی طرف۔ مثلاً بات تو کر رہی ہے رکمن کی ماں لیکن میرے بڑے بھائی جو سیٹھ رنچھوڑ لال جی کے ہاں ملیم ہیں، رکمن سے کہہ رہے ہیں:

"اچھا رکمن تو ہمارے ہاں چلی آ، ہم یہاں تجھ کو کوئی تکلیف نہ ہونے دیں گے، ہے نا!"

"اور پھر پانچوں بھائی سر ہلا کر کہتے ہیں: "ہاں، ہاں، ہاں، بھلا رکمن کی ماں اور رکمن تمہیں اپنے چچا کے ہاں رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں آجاؤ نا رکمن!"

"انسانی ہمدردی کے اس شدید مظاہرے کے وقت میری بھابیوں کی صورتیں دیکھنے کے لائق ہوتی ہیں۔ یا پھر کبھی یوں ہوتا کہ رکمن ہمارے گھر اداس اور غمگین صورت بنائے آتی اور

"پہلا بھائی: کیا بات ہے رکمن؟

"دوسرا بھائی: رکمن کیوں، کیا بات ہے؟

"تیسرا بھائی: رکمن اداس کیوں ہو؟ رکمن؟

"چوتھا بھائی: کیا کسی نے تجھے کچھ کہا ہے؟

"پانچویں بھائی کی باری آنے سے پہلے ہی رکمن پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی، اور سسکیوں کے درمیان کہتی جاتی: "چچا نے ماں کو آج پھر پیٹ ڈالا... چچا نے... چچا نے... ہوں... ہوں..."

"پانچویں بھائی نے گرج کر کہا: "چچا نے مارا؟ کیوں اسے کیا حق ہے تمہاری ماں کو پیٹنے کا؟ وہ کہاں سے آیا سالا، حرامزادہ، شہدا۔ کیوں جی؟ میں پوچھتا ہوں

اُسے تمہاری ماں کو بیٹنے کا کیا حق ہے ؟"

"اور چھوٹے بھائی ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر کہتے : کمبخت آج ہلا راستے میں کہیں تو اس سے پوچھ لوں گا کہ ایک غریب بیوہ کو کس طرح ستایا جاتا ہے ؟"

"چھوٹے بھائی کی لال لال آنکھیں دیکھ کر رکمن ڈر جاتی اور آہستہ سے کہتی : نہ ، نہ بھیا تم کہیں انہیں مار نہ بیٹھنا ، پھر تو آفت ہی آجائے گی !

"اور چھوٹے بھائی اسی "آفت" کے آجانے کے خیال سے چپ ہو رہتے۔ یوں بھی تو ہم سے کون اتنا دلیر تھا جو رکمن کے چچا سے جا کر لڑتا۔ وہ تو ایک بڑا ہی بدمعاش. چھٹا ہوا، پرلے درجے کا بدطینت آدمی تھا، اس سے لڑائی مول لینے کو کون تیار تھا۔ یہ ہمدردی کا شدید جذبہ تو میرے بھائیوں کے دل میں محض اسی لیے بار بار طوفانی صورت اختیار کر لیتا تھا کہ رکمن ایک نہایت ہی انجان، بھولی بھالی، معصوم اور بے حد خوبصورت دوشیزہ تھی اور میرے بھائیوں کی بیویاں بہت ہی جاہل . فربہ اندام اور بد صورت تھیں اور پھر انہیں آج تک اپنے متوسط طبقے کی معاشرت میں کسی حسین لڑکی سے باتیں کرنے اور اس کے ساتھ ہمدردی جتانے کا موقع نہ ملا تھا۔ جب وہ بیچارے دن بھر کی محنت و مشقت کے بعد تھکے ماندے گھر واپس آتے تو اکثر اپنی جاہل اور پھوہڑ بیویوں کو یونہی چھوٹی چھوٹی نکمی باتوں پر لڑتے جھگڑتے دیکھتے۔ اس امر کا نفسیاتی ردِ عمل تم جانتے ہو ایک ہی صورت اختیار کر سکتا تھا!"

"عشق یا ہوس!" میں نے آہستہ سے پوچھا

"کچھ سمجھ لو" کنہیا لال نے متین لہجے میں جواب دیا "یہ ایک ہی جذبے کے دو مختلف مدارج ہیں۔ میرے بھائیوں کو رکمن سے باتیں کرنے میں جو مزہ آتا تھا اسے حاصل

کرنے کے لیے اور اس کی لذت سے بہرہ ور ہونے کے لیے وہ مختلف طریق استعمال کرتے تھے، لیکن اگر ان تمام طریقوں کو اکٹھا کر کے انہیں جزیاتی صورت میں دیکھنے سے احتراز کیا جائے اور بحیثیت مجموعی ان پر نظر ڈالی جائے تو وہ تمام طریقے ایک تسلسل کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

"مثلاً تمام بھائیوں کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ اپنے جذبۂ ہوس کو ایک دوسرے سے چھپائے رکھیں، جہاں تک ہو سکے رکمن سے اس وقت بات کی جائے جب اور کوئی بھائی وہاں موجود نہ ہو، رکمن پر اپنی ذاتی ہمدردی خاندان کے دیگر اراکین سے الگ تھلگ ہو کر جتائی جائے، یہ ثابت کیا جائے کہ سچی ہمدردی صرف "اسے" ہو سکتی ہے اور باقی سب بھائی یونہی دکھاوے کے لیے باتیں بناتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔"

"اور تم؟" میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "تم ساتویں بھائی تھے اور غالباً بہت شریف ۔ ۔ ۔"

کنہیا لال شرما سا گیا، کہنے لگا: "میں؟ تو اُسے دیکھتا ہی رہتا، حتیٰ کہ وہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی، اس کی باتیں سنتا ہی رہتا، یہاں تک کہ وہ خاموش ہو جاتی اور پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے لگتی۔ میں تمہیں کیا بتاؤں میں اُسے کس قدر چاہتا تھا، چاہتا ہوں۔ رکمن کے آتے ہی میری حالت متغیر ہونے لگتی، خون کی روانی تیز ہونے لگتی، طاقتِ گویائی سلب ہو جاتی۔ میں اُس سے بات کرنا چاہتا لیکن نہ کر سکتا بس ٹکٹکی لگائے اس کی طرف دیکھتا رہتا۔ تمہیں کیا بتاؤں وہ کس قدر حسین ہے اور جب وہ مسکراتی ہے تو اس کے لبوں کی داہنی طرف ایک نہایت دلفریب خم پڑتا ہے جسے دیکھ کر میں اکثر دیوانہ ہو گیا ہوں۔"

کنہیا لال رُک گیا، پھر ذرا ٹھہر کر بولا۔

"پچھلی گرمیوں کی چھٹیوں میں مَیں نے کئی بار سوچا کہ اگر اُسے رکمن! رکمن! میری جانِ رکمن! کہہ کر بلاؤں تو پھر کیا ہوگا! وہ مجھے گالیاں تو نہ دے گی؟ وہ اپنی ماں سے جا کر تو نہ کہے گی؟ اپنے بھائیوں اور بدصورت بھابیوں کا تو مجھے مطلق خوف نہ تھا۔ آخر میں نے تہیہ کر لیا کہ رکمن سے بات کروں۔ مَیں نے دل میں سوچا کہ اس طرح خاموش محبت کرنے سے تو مر جانا ہی بہتر ہے۔ آخر ہوگا کیا، یہی نا کہ وہ میری محبت ٹھکرا دے گی۔ میں اس سے یہ کہوں گا اور وہ مجھے یوں جواب دے گی، جس کے جواب میں مَیں اُسے یہ کہوں گا اور وہ کہے گی کہ مجھے تو ڈر لگتا ہے، اور میں کہوں گا کہ ڈر کیسا؟ رکمن، جب دو دل محبت کرنے پر تل جائیں تو دنیا کی کوئی طاقت انہیں نہیں روک سکتی اور پھر وہ ایک شرمیلی ادا سے اپنے بازو میرے گلے میں حمائل کر دے گی، اور میں پیار بھری نگاہوں سے . . .

"یکایک ایک کھٹکا سا ہوا۔ میں چونک پڑا۔ سامنے دیکھا تو رکمن کھڑی تھی۔ سر پہ پانی کی گاگر اٹھائے ہوئے، اس کے ماتھے پر زلفیں بل کھائے بھیگی پڑی تھیں اور اس کی لانبی لانبی پلکیں بھی پانی کے قطروں سے جھکی پڑی تھیں۔ بڑی مشکل سے انہیں اوپر اُٹھا کر میری طرف دیکھ کر کہا: "کاہن ذرا گاگر تو اتروا دو۔"

"میں وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ آج کتنا اچھا موقع تھا! گھر میں کوئی بھی نہ تھا۔ نہ بھائی نہ بھابیاں۔ کتے بلیاں سب غائب تھے، کیسا عجیب اتفاق تھا۔ میں ایک گھبرائے ہوئے بطخ کے بچے کی طرح رکمن کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں نے کہا کاہن (وہ مجھے کاہن کہا کرتی ہے) ذرا گاگر اتروا دو۔ کھڑے کھڑے کیا دیکھ رہے ہو۔"

"میں نے گاگر اتروا دی۔"

"رکمن دالان کے ایک ستون کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ وہ ہانپ رہی تھی، چہرہ لال تھا۔ زلفیں لہرائی ہوئیں۔ "کیا کر رہے ہو؟" رکمن نے یونہی پوچھا

"کچھ نہیں، کچھ نہیں،" میں نے ایک مجرم کی طرح جواب دیا۔

"وہ ہنسی، یونہی، ایک دلکش ہنسی، جیسے کسی مست رقاصہ کے گھنگھرو ایک دم بج اٹھیں۔"

"پھر وہ چپ ہو گئی اور چند لمحوں تک کامل خاموشی رہی۔

"بھابیاں کہاں ہیں؟" اب پھر رکمن نے پوچھا اور اپنی جبین کے بال درست کرنے لگی۔

"پنڈت جگر رام کے ہاں کھنڈلے سے، وہاں گئی ہیں؟"

"اچھا!" اس نے "اچھا" کچھ اس طرح مدھم اور راز دارانہ لہجے میں کہا کہ میں نے سمجھا گویا ہوا کا کوئی لطیف جھونکا نیم کے نکیلے جھومروں میں نغمۂ حیات پیدا کرتے ہوئے گزر گیا۔

"پھر تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنی کمر کو جھٹک دیا۔ اپنے شانوں کو جھٹک دیا، اپنی گردن کو جھٹک دیا اور یہ سب کچھ بالکل غیر شعوری طریق پر ہوا۔ اس کے بعد اس نے لاابالیانہ انداز میں کہا: "اچھا کاہن میں چلتی ہوں"

وہ چلی گئی۔

"اسے اسے رکمن!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"وہ ڈیوڑھی سے لوٹ آئی: "کیا کہتے ہو؟" اس کا چہرہ بالکل بھولا بھالا اور ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔

"میری آنکھیں نیچی ہو گئیں، اور چہرہ بھی لال ہو گیا: "کچھ نہیں، کچھ نہیں رکمن،" میں نے آہستہ سے کہا۔

"وہ کچھ دیر تک وہاں کھڑی رہی اور میں اس سے نگاہیں نہ ملا سکا۔ پھر میں نے دیکھا کہ اس کے قدم آہستہ سے ڈیوڑھی کی طرف مڑ گئے۔

"وہ جا رہی تھی۔

"ارے بیوقوف، گدھے، وہ جا رہی ہے۔"

"میں بھاگ کر ڈیوڑھی کی طرف گیا۔ وہ اس تنگ و تاریک ڈیوڑھی میں سے گزر رہی تھی۔ میں نے دوڑتے دوڑتے رُک جانا چاہا لیکن میرے قدم مجھے اس کے پاس لے ہی گئے۔ میں نے اُسے بازوؤں سے پکڑ لیا اور کانپتے ہوئے لہجے میں کہا: 'رکمن، رکمن، میری بات سنو!' اور پیشتر اس کے کہ وہ میری بات سن سکتی، میں نے اپنے لب اس کے لبوں پر رکھ دیے۔

"رکمن کے بدن میں سر سے پاؤں تک ایک تھرتھری سی آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو مجھ سے جدا کیا اور پھر ایک زور کا طمانچہ میرے منہ پر رسید کیا اور ایک زقند لگا کر ڈیوڑھی سے باہر نکل گئی۔

"میں رکمن کے پیچھے بھاگتا ہوا گیا۔ بیوقوفوں کی طرح پیچھے بھاگ رہا تھا اور دل میں ڈر رہا تھا کہ اگر اس نے کسی سے کہہ دیا تو پھر؟ 'رکمن ذرا ٹھہرا تو سہی، تجھے پرماتما کی سوگند، رکمن!'

"لیکن رکمن روتی ہوئی، آنچل سے آنسو پونچھتی ہوئی آگے آگے بھاگی جا رہی تھی اور زور زور سے کہہ رہی تھی: 'ابھی ماں جی سے کہوں گی، ابھی چچا سے کہوں گی، ابھی چچا سے کہوں گی، ابھی تمہارے بڑے بھائیوں سے کہوں گی۔'

"کیا ہوا رکمن، تو میری بات تو سُن لے۔ تجھے دیوی کی سوگند اگر تو کسی سے کچھ کہے، تجھے گائے ماتا کی قسم!'

"رکمن ٹھہر گئی اور آتش بار نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر بولی: 'ایسی سخت قسمیں

دیتے ہوئے تمھیں شرم تو نہیں آتی؟"

"اب ہم دوڑتے بھاگتے گھر سے دور نکل آئے تھے، یہاں چھوٹے چھوٹے ٹیلے تھے اور ایک ریتلا میدان جس میں کہیں کہیں آک کی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ پرے ایک درختوں کا جھنڈ تھا اور اس کے پیچھے رکمن کے چچا کا گھر۔ اُس جھنڈ کی اوٹ میں سورج غروب ہو رہا تھا اور کوّے کائیں کائیں کرتے ہوئے مغرب کو بھاگ رہے تھے۔ سورج کی شعاعوں میں اُن کے پَر سونے کے بنے ہوئے معلوم دیتے تھے۔ میرے سامنے رکمن کمر پہ ہاتھ رکھے عجب شانِ دلربائی سے کھڑی تھی۔ اس کے آنچل کے کناروں سے سورج کی کرنیں چھن چھن کر آرہی تھیں۔

"اب کبھی چھیڑو گے؟" رکمن نے ملائم لہجے میں کہا۔

"میں نے سر ہلا دیا، "ہرگز نہیں۔"

"وہ ایک ٹیلے پر بیٹھ گئی اور پاؤں سے ریت کرید کرید کر ایک محراب سی بنانے لگی۔ جب محراب بن گئی تو اس نے آہستہ سے اپنا پاؤں محراب کے نیچے سے نکال لیا، اب ریت کی محراب تیار ہو چکی تھی۔ رکمن نے فتحمندانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا

"یہ کیا ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے اُس سے پوچھا

"یہ تمہاری قبر ہے!" رکمن نے شوخی سے کہا اور پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

"شریر لڑکی چیخ چیخ کر ہنس رہی تھی۔

"لاؤ ذرا دیکھیں تو،" میں نے اُسے پرے دھکیل کر کہا اور پھر لات مار کر ریت کی محراب کو مسمار کر دیا۔

"اوف!" اس کی ہنسی فوراً بند ہو گئی۔ "یہ تم نے کیا کر دیا! (ہاتھ بڑھا کر) لگاؤں ایک طمانچہ اور . . .؟"

"میں نے سر جھکا کر کہا، "ضرور، اب ایک نہیں ایک سو طمانچے لگاؤ، اگر اُف کر جاؤں

تو کمنا۔""

"وہ گھر جانے کے لیے آہستہ سے مڑی اور ڈوبتے ہوئے سورج کے تپتے ہوئے سنہری میاں نے یکایک اُس کے رُخ کو روشن کر دیا۔ اس کی نگاہوں میں ایک عجیب چمک تھی، جاتے جاتے اس نے مدھم لہجے میں کہا:

"ہم گھر جاکر کہیں گے کہ کاہن بڑا بدمعاش ہے!'

اتنا کہہ کر کنہیالال رُک گیا۔

"پھر؟" میں نے بے صبری سے پوچھا

"...پھر؟" کنہیالال نے آہستہ سے کہا، "پھر گرمی کی چھٹیاں ختم ہوگئیں اور میں یہاں چلا آیا۔"

ہم دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے آ رہے تھے اور پرے پیپل کے درخت کی ایک ٹہنی میں چاند ایک ٹوٹے ہوئے کنگن کی طرح اٹک گیا تھا۔ نیچے سڑک پر ایک پوربیا گاڑیبان "پتیم کیوں بھیو اداس، پتیم کیوں بھیو اداس" گاتے ہوئے بیل گاڑی چلاتا ہوا گزر رہا تھا۔

بہت دیر کے بعد میں نے کنہیالال سے پوچھا: "اور رکمن!"

کنہیالال مسکرا کر کہنے لگا: "میرے بھائی اپنی غلطیوں کا خمیازہ مجھے بھگتنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ انھوں نے روپیہ چاہا، انھیں روپیہ مل گیا۔ اب وہ اپنی بدصورت بیویاں دیکھ کر کڑھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ میری شادی بھی کسی موٹی، سانولی، اجڈ گنوارن سے کر دی جائے۔ لیکن میں روپیہ نہیں مسرت چاہتا ہوں، اور مسرت کا نام رکمن ہے۔ اور یہ بات رکمن بھی اچھی طرح سے جانتی ہے۔"

"یہ بات ہے!" میں نے سر ہلا کر کہا۔

"ہاں!"

بات ختم ہو گئی اور ہم دونوں برج پر سے اُٹھ بیٹھے، لیکن نیچے سڑک پر گزر جانے والے گاڑیبان کے لیے بات ابھی پوری نہ ہوئی تھی، وہ ابھی تک گاتا ہوا چلا جا رہا تھا:

"پتیم کیوں بھیو اداس! پتیم کیوں بھیا اداس!"

میرے لیے کالج کی زندگی بہت جلد ختم ہو گئی۔ بہت سالوں کے بعد مجھے ایک دن پھر کنہیا لال ملا۔ میں لاہور بسلسلہ سیاحت آیا تھا۔ کرسمس کے دن تھے اور انارکلی میں بہت رونق تھی۔ یونہی گھومتے گھومتے کنہیا لال مل گیا!

"ارے!"

میں نے اُسے بہت مشکل سے پہچانا۔ اس کا کھلتا ہوا رنگ اب دھوئیں کی طرح میلا ہو گیا تھا، جبین شکن آلود تھی، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں، ہونٹ خشک اور چہرے پر چھائیاں، جسم سوکھے ہوئے بانس کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ایم، اے انگریزی میں، اول رہا اور اب لاہور میں کسی کالج میں پروفیسر ہے

"مگر تمہیں ہوا کیا؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

میرا سوال سن کر وہ آہستہ لیکن بے حد تلخ لہجے میں بولا "میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستان کی موجودہ معاشرت میں عورت کو باعزت طریق پر حاصل کرنا ناممکن ہے۔ یہاں شادیاں ہوتی ہیں لیکن محبت نہیں ہوتی۔ ہمارے ماں باپ ہمیں سب کچھ معاف کر سکتے ہیں، ہمارے سب عیوب چھپا سکتے ہیں: قتل، چوری، ڈاکہ، بددیانتی، لیکن وہ یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتے کہ کوئی ان کی مرضی کے خلاف کسی لڑکی سے محبت کرنے کی جرأت کرے۔ نتیجہ؟ تم کہو گے نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ رکمن برہمنی تھی، اسے ایک پچاس سال کا بوڑھا لیکن امیر برہمن بیاہ کر لے گیا، میں بنیا تھا، میرے پلے ایک چڑچڑی گمگھدیا بھگیا کر باتیں کرنے والی بنیائن

باندھ دی گئی۔ بوڑھا برہمن چند مہینے ہوئے رام رام کرتا ہوا اس دنیا سے چل بسا اور اب کمسن اور حسین رکمن بیوہ ہے۔ ماں بھی بیوہ اور بیٹی بھی بیوہ۔ وہ اب میلے کپڑے پہنتی ہے اور ہر جگہ کاکر چلتی ہے، جیسے اپنے بوڑھے خاوند کی موت کی ذمے دار ہے۔"

میں نے بات کا رخ پلٹنا چاہا چنانچہ میں نے آہستہ سے کہا: "سناؤ تمہارے بال بچے تو ہوں گے؟ راضی خوشی ہیں۔"

جیسے اس نے میری بات کا غلط مطلب لے لیا ہو، وہ ملامت بار نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر بولا: "بچے پیدا کرنے کا یہ مطلب کیسے ہو سکتا ہے کہ مجھے اپنی بیوی سے محبت ہے۔ شادی ایک سودا ہے۔ دیگر اشیاء کی طرح لڑکے لڑکیاں بھی سیم و زر کے انباروں کے عوض بیچے جاتے ہیں اور یہ طریق موجودہ نظامِ زندگی کے عین مطابق ہے اور بچے۔۔۔" وہ ایک تلخ ہنسی ہنس کر کہنے لگا "بچے تو ایک کامیاب شادی کا جزوِ لاینفک ہیں اور پرماتما کا شکر ہے کہ ہندوستان میں ننانوے فی صدی شادیاں اس لحاظ سے کامیاب ہوتی ہیں۔ تمہیں میرے بچوں کا حال سن کر حیرت ہوگی۔ میں چھ بچوں کا باپ ہوں: رینگتے ہوئے بچے، بسورتے ہوئے بچے، چیختے ہوئے بچے" اور میری طرف غصہ بھری نظروں سے دیکھ کر بولا "اس میں میرا کیا قصور ہے۔ پچیس چھبیس سال کی جنسی فاقہ پرستی کے بعد اگر ہندی نوجوان کی زندگی میں ایک عورت آجائے تو وہ کیوں نہ چوم چوم کر اس کا حلیہ بگاڑ دے، مگر شرط یہ ہے کہ وہ عورت ہو کوئی عورت، ایک کانی عورت، لنجی عورت، ایک عورت جس کی شکل تمہارے کوٹھے کے پرنالے سے بھی زیادہ حسین ہو مگر وہ عورت ضرور ہو۔"

اس کا سانس پھول گیا اور وہ کہنے لگا: "کچھ مضائقہ نہیں۔ اب تھوڑے دن رہ گئے ہیں۔ اب رات کو مجھے بخار بھی ہو جاتا ہے کبھی کبھی کھانسی کے ساتھ خون کے قطرے بھی آجاتے ہیں۔ اب جلد ہی اس قید سے چھوٹ جاؤں گا لیکن مجھے اپنی فکر نہیں، مجھے فکر ہے تو

صرف یہ کہ میں جتنا روز بروز دبلا ہو رہا ہوں میری بیوی اتنی ہی موٹی ہوتی جا رہی ہے۔"

میں ہنسا: "بھائی کنہیا لال، معلوم ہوتا ہے تمہارا دماغی توازن برقرار نہیں رہا، ذرا کسی پہاڑ پہ چلے جاؤ۔ جو ہونا تھا ہو چکا خوش رہا کرو۔ دیکھو میاں کتنی چہل پہل ہے۔ یہ دلفریب ساریاں، بے فکروں کے قہقہے، رومان اور خوشی۔"

"رومان اور خوشی؟" کنہیا لال نے جھنجھلا کر کہا۔ اس کی آنکھیں بے نور ہو گئیں اور وہ پہلے سے بھی بدصورت نظر آنے لگا۔ "تم ان لوگوں کی خوشی کا غلط اندازہ کر رہے ہو۔ یہ لوگ پیدا ہونے سے پہلے مر چکے ہیں۔ ان کا گلا ان کے ماں باپ نے خود اپنے ہاتھوں سے گھونٹ دیا ہے۔ یہاں نہ رومان ہے نہ خوشی، یہ تو چلتی پھرتی لاشیں ہیں، لاشیں۔"

وہ رک گیا اور پھر میری طرف عجیب نگاہوں سے دیکھ کر بولا: "تم جانتے ہو جہاں رومان اور خوشی نہیں ہوتے وہاں کیا ہوتا ہے؟ وہاں ہوتا ہے! مذہب — مذہب، اور صرف مذہب۔ اب رکمن مجھ سے بات تک نہیں کرتی۔ وہ دن رات مالا جپتی ہے اور اپنے آپ کو اور مجھے دونوں کو پاپی سمجھتی ہے، ہا ہا ہا ہا!"

کنہیا لال زور زور سے ہنسنے لگا

کنہیا لال کی ہنسی نے بے اختیار میرے جسم کے رونگٹے کھڑے کر دیے، میرے سارے جسم میں ایک جھرجھری سی آئی اور میرے جسم کے روئیں روئیں کو کانپتا ہوا چھوڑ گئی۔ پتا نہیں کیوں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ کنہیا لال کے پچکے ہوئے گالوں کو دیکھ کر مجھے وہ ننھا سا ریت کی قبر یاد آگئی جو ایک شام غروبِ آفتاب کے وقت کالج کے ایک ریتیلے میدان میں ایک پنجابی دوشیزہ نے اس کے لیے تیار کی تھی۔

گوماں

نام ہے گومتی، پنڈت جی پیار سے گوماں کہا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں مجھے اس سے ایک طرح کا اُنس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے پیار کرتے ہیں، اس کی محبت کا دم بھرتے ہیں، اس کے چاہنے والوں میں سے ہیں، اپنا نام اس طرح جاں نثاروں میں لکھواتے ہیں کہ لوگ انہیں گومتی کا عاشق تصور کریں۔ مجھ سے کئی بار اس معاملے پر بحث کر چکے ہیں: "دیکھو بھئی میں مفت میں بدنام ہو رہا ہوں۔ لوگ طعنے دیتے ہیں اس بیچاری کو، لیکن اگر سچ پوچھتے ہو، تم جانتے ہو میں تم سے کوئی بات نہیں چھپاتا، دھرم سے کہتا ہوں، اور تم جانتے ہو مجھے دھرم سے بڑھ کر اور کوئی چیز پیاری نہیں، مجھے گومتی سے اُنس ہے، بس اُس اُنس میں گناہ کا شائبہ تک بھی نہیں، لوگ یونہی بدنام کرتے ہیں۔" ایک لمبی سانس لے کر:

"میرا کیا ہے! اکیلی جان ہوں، کچھ کٹ گئی ہے کچھ کٹ جائے گی، مجھے تو اس بیچاری کی فکر ہے۔ اور اگر اس کے خاوند کو پتا لگ جائے تو پھر کیا ہو۔ تم جانتے ہو مرد کتنے شکی

مزاج ہوتے ہیں اور عورتوں کو اپنا ناموس کس قدر عزیز ہے۔ گو میری محبت پاکیزہ ہے، تم جانتے ہی ہو، سانچ کو آنچ نہیں، پھر بھی خلق کا منہ کون بند کر سکتا ہے، تم جانتے ہی ہو، اچھا چھوڑو اس معاملے کو، لوگ یوں ہی شوشے چھوڑ دیا کرتے ہیں، ہمارا دل صادق ہے، لوگ جو چاہیں بکیں، آؤ چائے پئیں!"

اور پھر ہم چائے پینے میں مشغول ہو جاتے!

پنڈت جی بڑے مشہور ڈاکٹر ہیں قصبے اور آس پاس گاؤں کے تمام ڈھور ڈنگر ان کے پاس بغرض علاج آتے ہیں۔ ان کا پورا نام ہے: پنڈت بام دیوا گنی ہوتری آف سلوتری۔ میں نے انہیں اکثر اسی طرح دستخط کرتے دیکھا ہے، لوگ انہیں صرف "پنڈت جی" کہہ کر پکارتے ہیں۔ یوں بھی دیکھنے میں اچھے خاصے بدصورت ہیں اور انہیں اپنی کم مائگی کا اتنا ہی احساس ہے جتنا ایک حسین کو اپنے حسن کا۔

ایک دن آئینہ سامنے رکھے مونچھوں کو تیل لگا رہے تھے، یکایک بول اٹھے:

"لال حسین، تمہیں پتا ہے کنکریٹ کیا ہوتا ہے؟"

میں نے جواب دیا: "نہیں تو"

"دیکھو، ہم تمہیں بتائے دیتے ہیں، کنکریٹ وہ مسالہ ہے جس سے خالق باری نے بیسویں صدی کے انسان بنائے۔ یہ بات سائنسدانوں نے بڑی کھوج کے بعد دریافت کی ہے۔ انہوں نے اس مسالے کو تیار بھی کر لیا ہے مگر اس سے وہ انسان تیار نہیں کر سکے۔ اگر وہ ایسا کر سکیں تو ان میں اور پرمیشر میں کیا فرق رہ جائے، سچ ہے نا؟"

"بجا فرمایا آپ نے۔"

"تو دیکھو نا، ہم تم سب اس مسالے سے بنے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ خدا نے

آپ لوگوں کو پہلے بنایا اور مجھے سب سے آخر۔"

"وہ کیسے ؟"

"بڑی سیدھی بات ہے۔ دیکھو نا جب خدا سب لوگوں کو بنا چکا تو جو بچا کھچا مسالہ پڑا تھا اُسے دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا آخر اس کا کیا کیا جائے! بہت غور و خوض کے بعد اُس نے یہ فیصلہ کیا کہ اس سے ایک ایسا مجسمہ تیار کیا جائے جو سب سے انیلا ہو، اپنی نظیر آپ ہو، جس کے رُعبِ حُسن سے عورتیں غش کھا جائیں، بچے ماؤں کی گودیوں میں چھپ جائیں جس کے جلال سے مردوں کے پیٹ میں بل پڑ جائیں، ہنستے ہنستے قولنج ہو جائے۔ وہ نمونہ ہی مجسمہ میں ہوں۔ ذرا دیکھو تو: ناک اندر دھنسی ہوئی، چیچک کے داغ، مہاسے اور یہ ہونٹ پکے ہوئے انجیر کی طرح پھٹے ہوئے۔" یہ کہہ کر آپ نے آئینہ زور سے میز پہ پٹخ دیا، اور لگے اپنے آپ کو گالیاں دینے۔

پھر کچھ دیر ٹھہر کر گنگنانے لگے: "عشق تیرے میں صنم، میں نے صنم بول سہنے کہاں کہاں کس کس کے۔ کس کس کے! کس کس کے!"

آدمی کے مزاج میں تلوّن کو کتنا دخل ہے! یہ دیکھ کر میں بے اختیار ہنسنے لگا، پھر وہ بھی میرے ساتھ ہنسنے لگے: ہاہاہا۔

گومتی حسین ہے مگر اس کا حسن الجبرے کا فارمولا نہیں۔ ایک فنکار اس میں ہزاروں نقائص دیکھ سکتا ہے، اس کے سینکڑوں عیوب بیان کر سکتا ہے۔ یہ ہوتے ہوئے بھی اس کے حسن میں کچھ ایسی دلکشی و جاذبیت ہے جو دل کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ مجھے اس کی آنکھیں بہت پسند ہیں: بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ناگوری گائے کی طرح معصوم اور

پنڈت جی کو اس کی کھُردری اور وہ شیریں لوچدار آواز پسند ہے جسے سن کر ان کا دل کسی نامعلوم مسرت سے کانپنے لگتا ہے۔ قصبے کے حاکمِ اعلیٰ یعنی نائب تحصیلدار صاحب بھی اسے اکثر تعریفی نگاہوں سے دیکھا کرتے ہیں۔ گومتی ان تعریفی نگاہوں سے خوش ہو جاتی ہے۔ یہ خیال کہ وہ حسین ہے اور لوگ اسے چاہتے ہیں اسے ہر دم مسرور رکھتا ہے وہ اپنے خاوند پر حکومت جتا سکتی ہے، اس سے ایک نئے زیور کی فرمائش کر سکتی ہے، روٹھ جاتی ہے اور چاہتی ہے کہ اس کا خاوند اُسے منائے۔ وہ تین بچوں کی ماں ہے۔

اس کا خاوند ایک غریب دکاندار ہے۔ قصبے کے چھوٹے سے بازار میں ایک سرے پر چھوٹی سی دکان ہے۔ نمک، آٹا، تیل، کھنسار، گجریں وغیرہ بیچتا ہے۔ تند، ٹھنگنا، منحنی صورت، نہایت مریل۔ گومتی کو اس سے کیسے محبت ہو سکتی ہے؟ یہ بات میری سمجھ میں آج تک نہ آئی۔ اس کے کپڑے عموماً میلے رہتے ہیں، بیچارہ ہر وقت دکان پر بیٹھا رہتا ہے۔ ہمارے قصبے کی دکانیں شام کے چھ بجے بند ہو جاتی ہیں مگر بارہا جب ہم سیر کر کے شام کو آٹھ ساڑھے آٹھ بجے گھر لوٹے ہیں گومتی کے غریب خاوند کو ہم نے دکان پر ہی بیٹھا پایا ہے، اور اس وقت شمع کی جھلملاتی ہوئی لو میں اس کا چہرہ کتنا عجیب نظر آتا ہے۔ وہ بودھوں کے دلائی لامہ کی طرح صُم بُکم بیٹھا ہوتا ہے۔ وہ کیا سوچتا ہے؟ شاید وہ سوچتا ہی نہیں! شاید وہ کسی گاہک کا انتظار کر رہا ہے — ایسے گاہک کا جو کبھی آئے گا ہی نہیں یا شاید اسے پہلے کا یقین ہوتا ہے کہ حقیقی شہزادہ داستان سے اُٹھ کر تاریکی اس خاموشی، خشکی، ویرانی سے خالی دنیا میں چلا آیا ہے اور انتظار کر رہا ہے اس زمانے کا جس کی حقیقت آج محض افسانوی ہے، وہ منتظر ہے۔ اس کائنات کا جس میں ہارون الرشید، ابوالحسن، الٰہ دین، سند باد جہازی رہتے ہوں؟ کبھی اس کی دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے

یکایک ٹھٹھک کر رہ جاتا ہوں، اور جب وہ اپنے شانے سیکڑے، گردن نیچی کئے ہوئے بیٹھا ہوتا ہے تو مجھے ایسا احساس ہوتا ہے کہ کوئی منتر پڑھ رہا ہے۔ زمین پر کچھ پڑھ کر پھونک رہا ہے جس کے سحر سے یہ زمین ابھی پھٹ جائے گی اور ایک جن نمودار ہوگا جو رعد کی سی آواز میں بولے گا: "کیا چاہیئے؟" مگر ایسا کبھی نہیں ہوتا، اس رومانیت سے خالی دنیا میں ایسا کبھی نہیں ہوتا بلکہ ہر بار یہی ہوتا ہے کہ وہ غریب بنیا بول اٹھتا ہے:

"کیا چاہیئے، بابو جی؟"

اور میں جلدی سے گھبرا کر جواب دیتا ہوں: "تین انڈے مرغی کے!"

اور پھر مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ الف لیلہ کا بونا نہیں ایک غریب دکاندار ہے؟ گومتی کا خاوند۔ گومتی جسے میں اور نائب تحصیلدار صاحب تعریفی نگاہوں سے دیکھا کرتے ہیں اور بس۔ اس دنیا میں حسن ہے مگر رومان نہیں، محبت ہے مگر مجنوں ناپید۔ شاید یہی سوچ کر عمر خیام کو دنیا کے نامکمل ہونے کا احساس ہوا ہوگا۔

پنڈت جی دن میں دو بار آٹھ آنہ تولہ افیم کی چسکی لگاتے ہیں۔ افیون کی اتنی مقدار غالباً ہندوستان کے آٹھ کروڑ بیکار نوجوان گریجوایٹوں کو ابدی سکون عطا کر سکتی ہے اور ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کو گھٹانے میں ضبط تولید سے زیادہ ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ ہند کے اصلاح پسندوں کو مصنوعی اور غیر قدرتی طریقے چھوڑ کر اس نعمت خداداد کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ کیا عجب کہ اسی سے قوم کا بیڑا پار ہو جائے۔ پنڈت جی، سے پوچھیئے اچھی کی ڈکار لے کر یہی روح پرور باتیں کہتے ہیں اور پھر آلسی سے چپ ہو

چھٹانک ویسی شراب پی کر کس طرح ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو جاتے ہیں۔ اس وقت دنیائے سیاست کی باگیں ان کے ہاتھ میں ہوتی ہیں اور کل کائنات کے اسرار و رموز ان کے نطق میں۔ ایسی حالت میں جو دوا وہ تجویز کر دیں۔ بیمار حیوانوں پر اکسیر کی طرح اثر کرتی ہے۔ اس وقت کتنے ہی لوگ، کہ جن کے ڈھور ڈنگروں نے ان سے شفا حاصل کی ہے، ان کے جان و مال کو دعائیں دے رہے ہیں۔ کسی پیر یا سادھو کے استھان کی طرح شفا خانے میں لوگ آپ ہی دودھ، مکھن، پنیر، پھل لیے آ رہے ہیں۔ پنڈت جی نیک آدمی ٹھہرے، جو چیز دلی عقیدت سے پیش کی جائے اسے کس طرح نہ قبول کریں۔ طرفہ یہ کہ اکیلی جان، کیا کھائیں اور کیا نہ کھائیں، چنانچہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ دودھ، مکھن، پنیر اور پھلوں کا بیشتر حصہ گوماں کے گھر پہنچا دیا جاتا ہے۔ ویسے بھی انہیں گومتی کی لڑکیوں رانی اور بملا سے بہت الفت ہے۔ یہ سب اشیاء بچوں کے لیے بھیجی جاتی ہیں اور غالباً اسی لیے قبول کی جاتی ہیں۔ رانی بڑی شوخ و طرار ہے۔ پنڈت جی سے ہر روز کسی نہ کسی چیز کی فرمائش کر دیتی ہے مگر یہ فرمائشیں اکثر شکر کی ڈلی سے لے کر سیپ کی گڑیا تک ہی محدود رہتی ہیں۔ صبح سیر کرتے ہوئے وہ راستے میں گومتی کے گھر سے رانی یا بملا کو اٹھا کر سیر کے لیے لے جاتے ہیں اور شام کو ایک ہی کھاٹ پر بیٹھ کر گوماں سے گپ اڑاتے ہیں۔ ان دونوں کو اس طرح بیٹھے دیکھ کر لوکیشو کے شاہکار "حسن اور حیوان" کا تصور آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ گوماں کی وہ نشیلی نگاہیں پنڈت جی کے مزاج عمرانی پر بہ رحمت بن کر برستی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ان نگاہوں کی لا متناہی وسعتوں میں کھو دیتے ہیں اور اکثر بالکل بے خود ہو کر شام کو جھومتے ہوئے واپس گھر آتے ہیں۔

ایک شام کا ذکر ہے میں آتشدان کے قریب پاؤں پھیلائے اونگھ رہا تھا۔ مینہ برس کر تھم چکا تھا اور بادل مغرب کے قریب شفق سے گلرنگ ہو گئے تھے۔ جلتی ہوئی لکڑیاں چٹخ چٹخ کر مجھے لوری دے رہی تھیں اور قریب تھا کہ میں یہ دلفریب لوری سنتا سنتا ان کی آغوش میں گر جاتا اگر باہر کسی قدموں کی آہٹ نے نہ چونکا دیا ہوتا۔ مڑ کر دیکھتا ہوں کہ پنڈت جی شال نے سکیڑے، چہرے کو اپنے پلانے اور کوٹ کے اٹھے ہوئے کالروں میں چھپائے کھڑے ہیں۔

"کیا بات ہے پنڈت جی؟"

جواب ندارد۔

"چپ کیوں ہو گئے؟ کیا اُداس ہو؟"

کامل سکوت۔

"کہیں بے بھاؤ کی تو نہیں پڑیں، دوست؟"

کوٹ کے اُٹھے ہوئے کالروں سے ایک قہقہہ بلند ہوا، سکڑے ہوئے شانے سیدھے ہو گئے اور خمیدہ گردن نے اپنے آپ کو اُونچا کیا۔ میں چہرہ دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ یہ گوماں تھی؛ ہنس رہی تھی اور ہنستی ہوئی دہری ہوتی جا رہی تھی۔

میں جلدی سے ٹانگیں جھاڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور فرطِ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

کچھ توقف کے بعد میں نے گوماں سے پوچھا: "آپ یہاں کیونکر آئیں؟ پنڈت جی کہاں ہیں؟"

"نالے میں پڑے آپ کی راہ تک رہے ہیں۔"

"ہائیں!" میں نے گھبرا کر کہا، "کیا ہوا؟ کہیں ——"

وہ جلدی سے قطع کلام کر کے بولی، لیکن اب اس کی دلکش ہنسی غائب ہو چکی تھی:
"ہونا کیا تھا، خاک!" اُس نے تیز تر لہجے میں کہنا شروع کیا، "وہ آپ کا دوست پنڈت جی، پنڈت جی! بدمعاش کہیں کا... لچا... مگر نہیں،" اک دم اس کا لہجہ بدل گیا اور وہ تاسف انگیز لہجہ میں بولی "یہ سب میرا ہی قصور ہے۔"

کچھ دیر چپ چاپ سر جھکائے کھڑی رہی، پھر اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا، بولی: "بھائی، میں اسے کچھ اور ہی سمجھے ہوئے تھی۔ دنیا کچھ کہے میری نظروں میں وہ میرا بھائی تھا۔ میں نے اس کے لیے خاوند کی گھرکیاں سہیں، رشتہ داروں کے طعنے برداشت کیے مگر اس سے غیروں کا سا سلوک نہ کیا۔ آج اس کا صلہ یہ ملا کہ اس نے پکڑ کر میرا منہ چوم لیا... میں... میں..." یہ کہہ کر وہ رونے لگی اور اسی طرح روتے ہوئے اس نے پنڈت جی کا اوور کوٹ اتار کر مجھے دے دیا اور اسی طرح سسکیاں بھرتی ہوئی رخصت ہو گئی۔

"اور اس کمبخت نے میرے بال نوچ ڈالے۔" پنڈت جی آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے اور میں ان کے پیٹ پہ مالش کر رہا تھا۔ "میں تو بھلا شرابی تھا نشے میں چور تھا" اب وہ نشہ کدھر ہرن ہو گیا تھا۔" مگر اس نے میرا قطعاً کوئی خیال نہ کیا۔ اُس نے سب مجھے گالیاں دیں، میرا اوور کوٹ اتار لیا اور مجھے کان سے پکڑ کر نالے پر لے آئی۔ بارش بھی ہو رہی تھی، کمبخت۔ آہ! بند بند دکھ رہا ہے۔ اس نے میری رتی بھر پروا نہیں کی۔ آہ! وہ پھلوں کے ٹوکرے، دودھ کے کلسے، مکھن کے گولے۔"

میں ان کی دلچسپ باتیں سن رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا۔ میرے کانوں میں کسی،

ڈنڈے کا وہ ریکارڈ گونج رہا تھا: دل لگانے کا نتیجہ مل گیا۔

ان کے کوچے میں جو تو آئے دل گیا
دل لگانے کا نتیجہ مل گیا

دل اکثر اداس رہتا ہے۔ پنڈت جی نے اپنی رونی صورت کو دو آتشہ کر لیا ہے۔ دوستوں سے بے رخی، نوکروں سے خفگی اور حریفوں سے بے اعتنائی اختیار کر لی ہے۔ بات بات پر غصہ، بات بات پر ناراض۔ [illegible] صلح کی سب کوششیں ناکام رہی ہیں۔ دودھ کے ڈول لوٹا دیے گئے ہیں، پھلوں کے ٹوکرے بغیر ہاتھ لگائے واپس بھیج دیے گئے ہیں، مکھن ایک بال نکالے بغیر پھیر دیا گیا ہے۔ کریں تو کیا کریں؟ قریب کے ایک گاؤں کا نمبردار نور حسن اپنی خوبصورت گائے بھینٹ کرنے آیا، کہنے لگا: "پنڈت جی ذرا اسے دیکھیے، شاید سردی لگ گئی ہے، بدن کانپتا ہے، تھنوں سے ریشہ جاری ہے، کبھی کبھی کھانستی بھی ہے اور پچھلا داہنا پاؤں بار بار اٹھاتی ہے۔ پنڈت جی کوئی اچھی سی دوا دو، ابھی ایک مہینہ ہوا اسے کشتواڑ سے لایا ہوں، آپ کا بھلا ہوگا۔" پنڈت جی بیٹھے بیٹھے اٹھے، جلدی سے ایک شیشی اٹھائی، اسے گائے کا منہ کھول کر اور [illegible] چمچہ دوا انڈیل دی۔ [illegible] پھر جلدی میں [illegible] ٹنکچر آیوڈین [illegible] گائے نے [illegible] جان دے دی۔ نور حسن کو شبہ ہوا [illegible] خوبصورت گائے [illegible] ناگوری نسل — تھانے میں رپٹ لکھوا دی۔

شومیِ قسمت! پنڈت جی کو [illegible] "کچھ پتا" کا بہت افسوس [illegible] پر پولیس والوں نے تنگ کرنا شروع کیا۔ اصل میں یہ تھانے والے دوسرے دل سے

جذبات اور احساسات سے قطعاً بے پرواہ ہوتے ہیں۔ کبھی بھولے سے بھی ان کے دل میں یہ خیال نہیں گزرتا کہ وہ اپنے طرزِ عمل سے دوسروں کے نازک جذبات کو کتنی ٹھیس پہنچا رہے ہیں۔ پنڈت جی کو دیکھو بے چارے آپ ہی آپ شرم کے مارے مرے جا رہے ہیں۔ اب بھلا پولیس کو دخل در معقولات کی کیا ضرورت تھی!" گائے تو نورحسن کی مری یا ماری گئی، بھلا یہ تھانیدار صاحب کیوں پرائے پھٹے میں ٹانگ اڑاتے ہیں؟ اور ہمارے ان کے تعلقات کتنے برسوں سے خوشگوار چلے آ رہے ہیں، جب کہ یہ تھانیدار صاحب ابھی سرینگر میں سارجنٹ ہی ہوا کرتے تھے۔ خود میں نے کئی دفعہ ان کی بھینس کی مرہم پٹی کی ہے جب سکول کے لونڈوں نے اسے پتھر مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا اور آج یہ ہم سے تین سو روپیہ رشوت میں مانگتے ہیں اور طرفہ یہ کہ دھمکی دیتے ہیں جیل پہنچانے کی حوالات کی، کیوں؟" یہ کہہ کر پنڈت جی میری طرف تکنے لگے، میں نے نگاہیں نیچی کر لیں اور بوٹ کی نوک سے زمین کریدنے لگا گویا تین سو روپے زمین میں گڑے ہوئے تھے۔ اور بھلا کرتا بھی کیا؟ تین سو روپیہ کہاں سے لاتا! پنڈت جی نے تو کبھی پھوٹی پائی بھی نہ رکھی تھی۔ تنخواہ اور بالائی آمدنی کے علاوہ ہمیشہ ادھار مانگ کر کھایا کرتے تھے۔ زیادہ نہیں تو کم از کم ساڑھے تین چار سو تک انہیں قصبے کے دکانداروں کا دینا تھا اور ان سے اب کچھ مزید ملنے کی توقع نہ تھی۔ میں غریب آدمی ٹھہرا، ادھر ادھر سے مانگ تانگ کر پچاس روپے اکٹھے کیے، مگر یہ تو آٹے میں نمک کے برابر بھی نہ تھا۔ تھانیدار صاحب حرص و آز کے دانت تیز کیے ہوئے تھے، تین سو سے ایک پائی کم لینے کو تیار نہ تھے۔ بڑی مشکل کا سامنا تھا۔ اسی حیص بیص میں کئی دن گزر گئے۔ آخر ایک دن تھانیدار صاحب خود میرے پاس آئے، کہنے لگے: "کیوں بھئی پھر کیا صلاح ہے؟ چالان کر دوں۔ آخر کب تک

چپ بیٹھا رہوں گا۔ نور حسن بھی بگڑا ہوا ہے، فرض کی بجاآوری تم جانتے ہی ہو۔"

قرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ نور حسن نے آج تھانیدار صاحب کی مٹھی گرم کی تھی۔ فرض کی بجاآوری اتنے دن خاموش رہنے کے بعد آج پھر چمک اٹھی تھی۔

کوئی جواب نہ پاکر تھانیدار صاحب اٹھ کھڑے ہوئے "اچھا تو چلتا ہوں۔ اگر آج شام تک کچھ بن جائے تو بہتر، ورنہ کل تو معاملہ میرے اختیار سے باہر ہوگا۔"

پنڈت جی کو ساتھ لیے رات کے بارہ بجے تک در بدر گھوما کسی نے آس نہ بندھائی۔ رات ساری جاگتے کٹی اور صبح میلے کچیلے بادلوں کا لبادہ اوڑھے نمودار ہوئی۔ رات کو یہ خبر قصبے میں آگ کی طرح پھیل گئی تھی کہ پنڈت جی کو صبح گرفتار کیا جائے گا۔ صبح لوگ جوق در جوق آنے شروع ہوئے؛ ٹولیاں بناکر، دو دو، چار چار کھڑے تھے۔ کوئی کچھ کہتا، کوئی کچھ۔ کوئی پنڈت جی کی گئو ہتیا پر نفرین کرتا تو کوئی تھانیدار صاحب کی روپہلی مصلحتوں کا تذکرہ کرتا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ گھر کے اندر پنڈت جی چپ چاپ بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ جب چاروں طرف سے ناامیدی نے گھیر لیا ہو، اندھیرے میں کہیں بھی شعاعِ امید نہ دکھائی دیتی ہو اس وقت طبیعت میں اپنے آپ سکون پیدا ہو جاتا ہے، قلب میں دلیری اور ہر مشکل کا سامنا کرنے کی جرأت پیدا ہو جاتی ہے۔ پنڈت جی تو یوں بھی بے پروا، بے فکر، نتائج و عواقب سے بے نیاز طبیعت کے مالک تھے، جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا، صبر کرکے بیٹھے رہے۔ تھانیدار صاحب کی راہ دیکھ رہے تھے کہ آئیں تو کم از کم مغلظات سنا کر ہی اپنے دل کی بھڑاس نکال لیں۔

یکایک کسی کے بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی اور باہر لوگوں کی چہ میگوئیاں بھی یکایک بند ہوگئیں۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ یہ تھانیدار صاحب تھے۔

وردی پہنے ہوئے، ڈراتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ ان کے بعد پولیس کے تین سپاہی اور ان کے بعد ہیں پچیس ہمارے قصبے کے بھائی بند۔ تھانیدار صاحب نے ایک اڑتی ہوئی نگاہ سے میری طرف دیکھا اور سب کچھ سمجھ گئے۔ میں نے انہیں اندر لے جا کر تخلیے میں بات چیت کی، گڑگڑایا، پنڈت جی نے ان کے پاؤں بھی پکڑ لیے مگر وہ خدا کا بندہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ پچاس روپے میں وہ معاملہ کیسے دبا سکتا تھا؟ اکیلا نور حسن ہی بمشکل ڈیڑھ دو سو لے کر راضی ہوگا۔ مقدمہ بالکل صاف تھا، گواہ موجود تھے۔ تھانیدار صاحب کو خود بہت رنج تھا۔ کیا وہ پنڈت جی کی گرفتاری کو پسند کرتے تھے؟ ہاں وہ اتنا کر سکتے تھے کہ پنڈت جی کو ہتھکڑی لگائے بغیر گرفتار کرتے۔

جب تھانیدار صاحب اپنا منشا ظاہر کر چکے تو پنڈت جی نے اٹھ کر اپنا اوور کوٹ اوڑھا اور نگاہیں نیچی کر کے بولے: "چلیے، جدھر لے چلو، چلتا ہوں۔"

میرا دل بھر آیا۔ پنڈت جی لاکھ برے سہی، پھر بھی میرے دوست تھے۔ بس چلتا تو اس کمبخت تھانیدار کی بوٹی بوٹی نوچ لیتا، مگر کیا کرتا، اپنے بس کی بات نہ تھی۔ زہر کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ پنڈت جی چلے۔ آگے آگے تھانیدار صاحب تھے اس کے بعد پنڈت جی سر جھکائے ہوئے، ان کے بعد پولیس کے سپاہی۔ لوگ آنگن میں کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ اہلِ قصبہ میں ایسا کون شخص تھا کہ جس کے مال مویشی کی خدمت پنڈت جی نے نہ کی تھی۔ اس آنگن میں رلدو رام شاہ بھی کھڑے تھے اور گھسیٹا مل بھی، چودھری پیر بخش بھی تھے اور ملک سردار خاں بھی مگر کسی کو نہ ترس آیا نہ خوفِ خدا، سب مل کر تماشا بنے کھڑے تھے۔ تھانیدار صاحب ابھی بمشکل آنگن میں چار قدم چلے ہوں گے کہ دروازے پر کسی نے روک لیا اور کسی کی حسین آواز سنائی دی: "ٹھہریے۔"

مجھے کسی کی میلی کچیلی ساڑھی کا پلو نظر آیا۔ آگے بڑھ کر دیکھا: گومتی تھی، سمٹی جا رہی تھی۔ تھانیدار صاحب ایک طرف ہو گئے۔

گومتی نے پنڈت جی کی طرف دیکھا، وہ سر جھکائے صم بکم کھڑے تھے۔ پھر اُس نے میری طرف دیکھا اور آنکھیں جھکا کر بولی: "بھائی، میرے بھائی کو چھڑا دو۔" یہ کہہ کر اُس نے آہستہ سے ایک روپوں سے بھری ہوئی تھیلی میری طرف بڑھا دی۔

"بھائی، میرے بھائی کو چھڑا دو۔"

گومتی کے اس ایک جملے نے پنڈت جی کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا، انھوں نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے روپے لینے سے روک دیا اور آگے بڑھ کر گومتی کے پاؤں چھو لیے اور نمناک لہجے میں بولے: "بس بہن تمہارے روپے مجھے پہنچ گئے۔ میں قید سے آزاد ہو گیا۔" پھر تھانیدار صاحب کی طرف دیکھ کر پرجوش آواز میں بولے "چلو، اب دیر کیوں لگا رکھی ہے؟"

پنڈت جی چھ مہینے سے جیل میں ہیں۔ وہاں افیم ملتی ہے نہ شراب۔ خوب مزے میں ہیں۔ کہتے ہیں: "گومتی نے مجھے سدھار دیا۔"

مصوّر کی محبّت

دھرمسالہ

۲۰ر ستمبر

میری کملا

کتنی مختصر سی بات تھی جسے تم نے افسانہ بنا دیا۔ میری نگاہوں میں تم آج بھی وہی ہو جو سوشیلا کے آنے سے پہلے تھیں۔ میرے لیے پہلے کی طرح ہی دلکشی وجاذبیت کا کامل ترین حسین مجسمہ ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری محبت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ پہلے کی طرح ہی پُرجوش اور ہیجان انگیز ہے اور اس میں تمہاری دوری نے اور یاد نے کرب کا اضافہ کر دیا ہے۔ زندگی کے ان چند خوش آئند لمحات کو، جو میں نے تمہارے قرب میں بسر کیے، اپنا سرمایۂ حیات سمجھتا ہوں۔ انہیں بھلا کیسے سکتا ہوں؟ تمہیں بھلا دینا — تم، جو کہ

ان لمحات کا سرچشمہ و منبع ہو — ایک ناممکن امر ہے۔

اور پھر —— سوشیلا؟ —— میں حیران ہوں تم نے سوشیلا کا نام کیوں لیا؟ کیا یہ صحیح ہے کہ عورت جوشِ رقابت میں عقل و حواس بھی کھو بیٹھتی ہے؟ اور پھر اس رقابت کا علاج کیا ہے؟ آخر تم نے میری محبت کو "بھابو" (ہربنس کور) سے کیوں نہیں منسوب کیا؟ وہ بھی تو سوشیلا کی طرح موٹی ہے اور اتنی ہی کند ذہن۔ اور تمہارے ہوسٹل میں وہ جو خوبصورت دھوبن آتی ہے، کیا نام ہے اُس کا؟ —— نوران؟ —— ہاں —— ہاں! وہی نوران جسے دیکھ کر اُدھی چغتائی کی پُرکیف تصویریں بھی بھول جاتا ہے، تم نے اس کا نام کیوں نہ لیا۔ تم جانتی ہو فنی نقطۂ نگاہ سے میں اس کا کتنا پرستار ہوں۔ اگر تم اس کا نام ہی لے بیٹھتیں تو مجھے رنج نہ ہوتا۔ بنگال کے سرتاج شاعر چنڈی داس کو ایک دھوبن سے عشق تھا۔ میں تو خیر ایک معمولی مصوّر ہوں جس کا شاہکار یہ ہے کہ اس نے اپنے دل کے قرطاس پر تمہاری تصویر کھینچ لی ہے۔ اجنتا کے رنگین نقوش کچھ مٹ چکے ہیں کچھ مٹ جائیں گے مگر میری موت ہی شاید تمہاری صورت کو میرے دل سے مٹا سکے۔ شاید اس لئے کہ موت کے بعد کا مجھے علم نہیں!

اس اعترافِ محبت کے بعد تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر میں نے سوشیلا کو خط لکھ دیا تو کیا بُرا کیا؟ کیا کسی کے خط کا جواب دینا گناہ ہے؟ ممکن ہے کہ تمہاری اصطلاح میں ایسا ہو، مگر میں حسین نہیں اور نہ تمہاری طرح تشنگیٔ ذوقِ تم کے جذبات سے بے نیاز ہی۔ اور اگر سوشیلا نے اپنے خط کے ہمراہ اپنی تصویر بھی بھیج دی تو غالباً اس کا یہ مدعا ہرگز نہ تھا کہ تمہارے سینے میں حسد کی آگ مشتعل ہو جائے۔ غالباً وہ صرف اتنا چاہتی ہے کہ میں اُسے یاد رکھوں۔ شاید اسے مجھ سے محض افلاطونی محبت ہے، اور یہ کوئی

اتنا بڑا جذبہ نہیں جتنا تم اسے سمجھتی ہو۔ شیلے کو غور سے پڑھو۔ اس کی شاعری "محبت میں افلاطونیت" کی بہترین مثال ہے۔ شیلے کی شاعری بھی اسی افلاطونی محبت کے طفیل زندہ ہے۔ شیلے کو غور سے پڑھو ورنہ ایم۔ اے میں فیل ہو جاؤ گی، امتحانِ محبت تو الگ رہا۔

اور کیا لکھوں! میں جانتا ہوں کہ یہ خط پڑھنے کے بعد تم مجھ سے روٹھ جاؤ گی۔ مگر مجھے تم سے وہ لازوال، بے پایاں محبت ہے کہ میں تمہارے روٹھ جانے کی ذرہ بھر بھی پروا نہیں کر سکتا۔ عمر خیام کے بعد دنیا میں اگر کوئی دوسرا قنوطی پیدا ہوا ہے تو وہ میں ہوں۔ بہتر ہوگا کہ مجھ سے روٹھنے کی صلاح نہ کرو۔ بہترین بات یہ ہوگی کہ رقابت کو دل میں جگہ نہ دو، میں تمہیں مناؤں گا بھی نہیں اور تم مفت میں اپنا دل جلاؤ گی۔

میں یہاں جھیل پر مچھلی کا شکار کر کے اور لمبی لمبی سیریں کر کے اپنے دن گزار رہا ہوں۔ میری صحت پہلے سے بہت اچھی ہے مگر میں اس وقت تک تمہارے پاس مسوری آنے کا خیال بھی نہیں کر سکتا جب تک کامل طور پر صحت یاب نہ ہو جاؤں۔ کہتے ہیں کہ اختلاجِ قلب کے لیے قربِ محبوب موافق نہیں۔

نوری کی تصویر قریب قریب مکمل ہو چکی ہے۔ افسوس ہے کہ ڈاک میں یہ تصویر تمہیں نہیں بھیج سکتا ورنہ تمہاری ناقدانہ رائے سے بھی فائدہ اٹھاتا۔ اس کے بعد میں بگی کی تصویر کو شروع کروں گا۔ بگی کون ہے؟ میں اس دلچسپ ہستی کے متعلق اگلے خط میں لکھوں گا۔ فی الحال یہی لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ بگی ایک عورت ہے۔

تمہارا ۔۔۔ شیام سندر

دھرم سال
۱۸ اکتوبر

میری بیوقوف کملا

کہتے ہیں حسن کو عقل سے خدا واسطے کا بیر ہے اسی لیے میں نے تمہیں بیوقوف لکھا۔ یوں تو تم کہنے کو ایم۔ اے میں پڑھتی ہو مگر اس امر سے تمہاری عقل کو کچھ سروکار نہیں۔ یہ سب ہمارے طریقۂ تعلیم و نصاب تعلیم کی خام کاریاں ہیں ورنہ یہ ممکن تھا کہ تم جیسی سیم تن دوشیزائیں کالجوں میں لڑکوں کے دوش بدوش پڑھتیں اور مارشل اور مارکس کے معاشی نظریوں کی اس جاہلانہ انداز میں تنقید و تنقیص کرتیں۔ چھوڑ دو خدارا ان نظریوں کو۔ ان میں کیا پڑا ہے؟ آج تک کوئی عورت اقتصادیات و معاشیات کی ماہر نہیں بن سکی۔ یہ کرخت مسائل صنفِ کرخت ہی کے لیے رہنے دو۔ ان معاشی و اقتصادی فلسفوں میں اُلجھ کر تمہاری والہیت، رنگینی، معصومیت سب فنا ہو جائیں گی اور اس وقت دنیا کو انہی چیزوں کی بڑی ضرورت ہے۔ یہ سب نظریے تمہارے لیے بنائے گئے ہیں نہ کہ تم اُن کے لیے۔ تم کو کم از کم میرے جذبات و حسیات کا احترام کرنا چاہیئے۔ میں مصور ہوں، حسنِ سرکش، حسنِ بے باک کو پسند کرتا ہوں مگر وہ حسن جو محتاج ہو عینک کا مجھے کسی حالت میں گوارا نہیں۔ شیلے کو دیکھو۔ شیلے اپنی شاعری کے بعض لمحات میں دنیا کا سب سے بڑا شاعر نظر آتا ہے۔ آج بے وقت گاڈون کو کون پوچھتا ہے۔ اس کا نام محض شیلے کے نام سے زندہ ہے کیوں کہ شیلے کا استاد تھا یا یوں کہو کہ شیلے اُسے اپنا استاد سمجھتا تھا۔ گاڈون کے پاس دو چیزیں تھیں: ایک اس کا اشتراکی مسئلہ دوسری اس کی لڑکی میری۔ شیلے نے میری کو پسند کر لیا۔ اسی میں اُس

کی عظمت پنہاں ہے۔ تمہارے سامنے دو چیزیں ہیں: ایک طرف ہیں رکارڈو کے نظریات اور دوسری طرف ہے محبّت — وہ والہانہ محبت جو قیودِ مذہب و ملت سے بیگانہ ہے، ان تمام نظریوں اور الجھنوں سے ناآشنا ہے، وہ محبت جو ایک فرد کو دوسرے فردِ واحد سے ہو سکتی ہے اور جس میں اشتراکیت کا شائبہ تک بھی نہیں۔ اپنی عظمت کو پہچان لو۔

ں گی کی تصویر بنانی شروع کر دی ہے۔ گی ایک گوالن ہے۔ نہایت خوبصورت اور رعنا ... بے وقوف۔ کل میں نے جھیل کے کنارے بیٹھ کر اسے تمہارا خط پڑھ کر سمجھایا اور میں یہ دیکھ کر بڑا حیران ہوا کہ اُسے رکارڈو کے نظریے کی مطلق پروا نہیں اور نہ وہ اسے تمہاری طرح عورتوں کا مبلغانہ کارنامہ ہی تصور کرتی ہے۔ وہ مجھ سے شادی کی خواہاں ہے، وہ چاہتی ہے کہ اس کے نو دس بچے ہوں۔ بے وقوف لڑکی! وہ جرمنی یا اٹلی میں پیدا ہوتی تو شاید اس کے نصیب کھل جاتے۔ کیا عجب کہ ہٹلر یا مسولینی اس سے شادی کر لیتا۔ اور مجھے یہ لکھتے ہوئے بہت افسوس ہوتا ہے کہ اُسے اتنا پتا بھی نہیں کہ سلجمین کے نظریۂ محصولیات میں کیا کیا خامیاں ہیں اور مسٹر صاحب نے انہیں کس خوبی سے رد کیا ہے۔ ہاں اس کے بال بہت خوبصورت ہیں۔ سونے کے باریک تاروں کی طرح نرم و نازک اور آپس میں اس طرح اُلجھے ہوئے کہ گمان ہوتا ہے ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں ان گیسوؤں میں آ کر بند ہو گئی ہیں۔ شام کے وقت جب میں بنسی کی ڈور ہاتھ میں لیے جھیل کے کنارے بیٹھتا ہوں اور جب شفق کی ارغوانی روشنی جھیل کے نیلے پانی سے کھیلتی ہے اس وقت وہ نوجوان گوالن ایک ننھا سا بھیڑ کا بچّہ گود میں لیے مدھم سروں میں گاتی ہے۔

مینوں دس کھاں نی مائے

کدوں گھر آوسی ماہیا   لیسی گلّے نال لا ماہیا

مینوں دس کھاں نی ملئے   مینوں دس کھاں نی مائے

بگی کی آواز میں لوچ ہے اور درد بھی اور بے انتہا تاثیر بھی۔ میں نے اُس سے پوچھا، "بگی! تم نے کون سے میوزک اسکول میں تعلیم پائی ہے۔" وہ کھِل کھِلا کر ہنس پڑی۔ کہنے لگی: "میوزک اسکول کیا ہوتا ہے؟" میں نے کہا: "جہاں یہ گیت سکھائے جاتے ہیں، گانا اور سُروں کا اُتار چڑھاؤ۔" بولی، "اِدھر اب۔" اس کی آنکھیں ایک لمحے کے لیے خوابیدہ سی ہو گئیں: "خبر نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟ لو آگے سنو،"

دھمائیں اڈّی ال ماہیا   میرا تیرے اتے دل ماہیا

ہن آ، ہن آ ماہیا   گل نال لا، نال لا، ماہیا

مینوں دس کھاں نی مائے

کتنا دلفریب نغمہ تھا اور کتنا پر اثر جادو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پانی کا ہر قطرہ اور پانی پر جھکی ہوئی ٹہنی کا ہر پتا ترنم خیز ہے یا ہر ذرّہ کائنات گویا من بن گیا تھا اور بیٹھے بیٹھے سُروں میں گا رہا تھا:

مینوں دس کھاں نی مائے   مینوں دس کھاں نی مائے

کرشن جی کی بنسی شاید انہی گوالنوں میں گونجی تھی اور رادھا جی بھی شاید کوئی ایسی ہی گوالن ہوں گی۔ اگر رادھا جی آج زندہ ہوتیں تو خدا جانے شہرت لورڈ کی موجودہ سفارشات کے متعلق ان کی کیا رائے ہوتی؟ دلچسپ سوال ہے اور تم جیسی ماہر اقتصادیات کے لئے تو سوچنے کے لیے نہایت موزوں۔ مجھے اُمید ہے کہ میری مجبور یہ

اپنے خط میں ضرور اس دلچسپ سوال پر روشنی ڈالے گی۔

منجھلے بھائی اترسوں لاہور روانہ ہو گئے ہیں۔ انہیں ایف۔ اے کے ضمنی امتحان میں بیٹھنا ہے۔ وہ مسوری میں ضرور تم سے ملیں گے۔ نوراں کی تصویریں ان کے حوالے کر دی گئی ہے، سنبھال کر رکھنا۔ فیروز بھائی ہنوز لاہور کی بستیوں میں گرمائی ٹینس ٹورنمنٹ کھیل رہے ہیں یا مسوری پہنچ گئے ہیں؟

تمہارا — شیام سندر

دھرمسال

۲۱ر اکتوبر

کملا!

معلوم ہوتا ہے کہ بخت کی نامساعدت ابھی میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ اختلاج قلب کا دورہ پچھلے چند دنوں سے پھر تیز ہو گیا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ بیمار کا حال اچھا ہے چند دنوں میں صحت یاب ہو کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا مگر شاید قسمت کو کچھ اور ہی منظور ہے۔

اچھا تو کالج کھل گئے ہیں۔ یہ تم نے نئی بات بتائی ورنہ مجھ ایسے گنوار کو بھلا کب اس بات کا پتا چلتا۔ میں نے مزید ایک مہینے کے لیے چھٹی کی درخواست کالج میں بھیج دی ہے۔ فیروز بھائی کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تمہاری اور سوشیلا کی آپس میں گہری چھنتی ہے۔ کلاس روم میں بھی دونوں سہیلیاں ہمیشہ اکٹھی بیٹھتی ہیں اور ریفریشمنٹ روم میں بھی اکٹھے جانا ہوتا ہے — بازو میں بازو ڈال کر۔ میں نہ کہتا تھا کہ سوشیلا بہت

اچھی لڑکی ہے۔ گو اس کی ناک بہت چھوٹی ہے مگر اس کا دل اتنا فراخ ہے کہ بیک وقت اس میں چار عاشق اور قریب قریب اتنی ہی سہیلیاں سما سکتی ہیں۔ میں اس بہناپے پر بہت خوش ہوں اور اس بات کی امید میں ہوں کہ تم بھی میرے اور بگی کے رشتۂ محبت کو خلوص کی نظروں سے دیکھ سکو۔ "نورن" تمہیں پسند آئی ہے مگر "نورن" کسے پسند نہیں۔ سید صاحب نے بھی اپنے خط میں شاباش کے لڈو بھیجے ہیں، لکھتے ہیں کہ "امسال کہ لجنیٹ آرٹ سوسائٹی کی سالانہ نمائش پر تمہاری نورن کی تصویر کی بھی نمائش کریں گے۔" ہزار ہزار شکریہ۔ مگر میں یہ جاننے کے لیے بے چین ہوں کہ خود نورن کی اپنی تصویر کے متعلق کیا رائے ہے؟ تم نے اسے یہ تصویر تو دکھائی ہوگی؟

میں نے شروع شروع میں بگی کی تصویر کا ہلکا سا خاکہ تیار کرنا چاہا تھا مگر مجھے اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ اصل بات تو یہ ہے کہ میرے ہاتھ اس کی تصویر پہ جمتے ہی نہیں۔ پتا نہیں کیوں؟ جوں جوں بگی کو دیکھتا ہوں مجھے اس کے متعلق نئی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ بظاہر نہایت خفیف لیکن باطن میں نہایت نمایاں، دل کی گہرائیوں تک پہنچی ہوئی وہ ایک ایسا جواہر ریزہ ہے کہ جس کے ہر کونے سے اور ہر پہلو سے ایک نئی شعاع کا انعکاس ہوتا ہے۔ میں جب تک اس کے دل کی مختلف کیفیتوں اور نیرنگیوں کو نہ پا لوں اس کی تصویر کو کیسے شروع کر سکتا ہوں۔ ممکن ہے کہ تمہیں مونا لزا کی تصویر اس موقع پہ یاد آ جائے مگر میرے خیال میں اطالوی مصور نے مونا کے دل کی گہرائیوں کو پا لیا تھا ورنہ ناممکن تھا کہ وہ ایسا بلند پایہ مصوری شاہکار آرٹ کی دنیا میں پیش کر سکتا۔ مصور اور معمول کے درمیان ایک نازک ترین رشتہ ہے، اسے سمجھے بغیر کوئی مصور حقیقی معنوں میں کامیاب نہیں کہلا سکتا۔ تم نے اپنی فطرت کو ہمیشہ مجھ

سے چھپایا ہے۔ میرے نزدیک تمہاری دلکشی کا غالباً یہی بڑا سبب ہے اور شاید اسی وجہ سے میں تمہاری تصویر اس وقت تک نہیں بنا سکا۔ تمہاری ہستی چھوئی موئی کی طرح ہے جو ہاتھ لگانے سے بند ہو جاتی ہو، اس طرح کہ پھر کوئی تمہارے دل کے طوفانی جذبات کا اندازہ نہیں کر سکتا اور ــــ اور ــــ تم ــــ کوہستانی گلاب کی ایک کلی ہے حیا سے سمٹی ہوئی اور پتوں میں چھپی ہوئی نرم نازک۔ مگر وہ کھل رہی ہے آہستہ آہستہ، ہر روز ایک دو نئی پتیاں کھل جاتی ہیں، اور اپنی رنگینی سے دل کو مسرور بناتی ہیں۔ ایک دن یہ کلی پھول کی طرح کھل جائے گی ــ شگفتہ اور ہنستا ہوا پھول، پھر میں شاید اس کی تصویر بنا سکوں، ابھی نہیں۔

لاہور میں تو گرمی ہوگی۔ سکنجبین مفرح اور لیمونیڈ کا استعمال ہوتا ہوگا مگر یہاں اب، سردی ہو گئی ہے۔ میں تو اونی کپڑے پہنتا ہوں اور چائے پیتا ہوں۔ اگلے مہینے غالباً برف باری بھی شروع ہو جائے گی۔ جھیل کا پانی ٹھنڈا ہوگا اور کناروں پہ یخ بستہ بھی۔ شام کو مچھلیاں پکڑنے کی بجائے آگ تاپی جائے گی اور جنوں بھوتوں کی کہانیاں صاحب دین چوکیدار سے سنی جائیں گی۔

اگلی ڈاک میں مارس لیول کی ایک دو کتابیں بھیج دینا۔

تمہارا مسعود

دھرمسال

۱۰ر نومبر

فیروز بھائی

آج بگّی کی موت کو سات روز ہو گئے۔ میں سوچتا ہوں، میرا کیا بنے گا اور یہ بے صرف کائنات میرے کس کام آئے گی؟ میں، جو ہر شے کے مصوری پہلوؤں پر نظر ڈالنے کا عادی ہوں آج اس کرب انگیز حقیقت کا احساس کر رہا ہوں کہ دنیا میں سچی خوشی کی بنیاد ظاہری نہیں بلکہ محض نفسیاتی اور جذباتی ہے، ورنہ نا ممکن تھا کہ مجھ جیسی قنوطیت پسند طبیعت پر بگّی کی موت کا اتنا اثر ہوتا اور وہی دلفریب قدرتی مناظر جو ایک ہفتہ پہلے میری روح کو بالیدگی بخشتے تھے اب یوں مجھ پر خندہ زن ہوتے۔ پرسوں سے پھر برف باری جاری ہے اور میں سامنے بند دریچے کے شیشوں میں سے ان برف کے گالوں کو دیکھ سکتا ہوں جو چپ چاپ کسی بے کس کے آنسوؤں کی طرح زمین پر گر رہے ہیں۔ کُل دنیا اس سپید خموشی کے لبادے میں لپٹی ہے۔ پرندے بھی خاموش ہیں، ہوا بھی ساکن ہے اور چاروں طرف موت کا سکوت چھایا ہوا ہے مگر میرے دل میں اک قیامت خیز ہیجان بپا ہے۔

آج سے ٹھیک دس روز پیشتر بھی اسی طرح برف باری شروع ہوئی تھی لیکن آج اور اس دن میں کتنا فرق ہے!

میں اس روز جھیل میں ایک ہلکی سی ناؤ کو کھے رہا تھا۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ جھیل کے پانی کی طرح نیلا اور مغربی شفق سے رنگین۔ میں ناؤ چلا رہا تھا اور ایک مبہم خوشی کے زیر اثر ایک بے معنی پہاڑی گیت گا رہا تھا۔ جھیل کے اس پار بگّی پلوڑ چرا

رہی تھی اور مجھے اس کے کاندھے پر رکھی ہوئی لاٹھی اور تارہائے عنکبوت کی طرح چمکتے ہوئے بال صاف نظر آرہے تھے۔

اتنے میں زور کا جھکڑ چلنے لگا۔ آسمان پر کالے کالے بادل اُٹھے۔ ہوا میں تیزی اور خنکی آگئی اور جھیل کا پانی لہریں مارنے لگا۔ میں نے بھی زور زور سے کھینا شروع کر دیا اور ناؤ کو جلدی سے پار لگانے کی کوشش کی۔ بمشکل کنارے پر پہنچا تو بوندا باندی اور پھر ساتھ تڑا تڑ اولے بھی برسنے شروع ہو گئے۔ بہزار خرابی کشتی کو کنارے پر گھسیٹ کر ایک جھاڑی سے باندھا اور دور پرے ایک درخت کو دیکھ کر اس کی طرف بھاگا۔

اولے پڑتے گئے میں بھاگتا گیا۔ اپنے سر کو بچانے کے لیے میں نے اپنا کوٹ اتار کر دونوں بازوؤں سے سر کے اوپر چھاتے کی طرح پھیلا دیا اور بھاگتا گیا۔ بجلی کی چمک، بادل کی گرج اور ہوا کے برفانی فراٹے ہوش و حواس گم کیے دیتے تھے۔ آخر وہ درخت قریب آگیا اور میں ایک جست لگا کر اس کے تنے سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا، آنکھیں بند کر لیں اور دل پہ ہاتھ رکھا۔ بچارا کتنے زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی پھوٹ جائے گا۔ ایک طویل عرصے کے بعد جب سانس کی وہ دھونکنی ڈھیلی پڑی، دل ٹھکانے آیا اور حواس بجا ہوئے۔ تب جاکر کہیں میری آنکھیں کھلیں اور میں نے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔

بخدا کتنا بڑا سرو کا درخت تھا۔ صرف تنے کا پیٹ ہی ساٹھ ستر فٹ ہوگا اور کتنا اونچا درخت تھا۔ دور اوپر کہیں سے اولوں کی "تڑا تڑ" کی آواز آرہی تھی مگر اس گھنے چھتنار سے کے نیچے کوئی اولا نہیں گرتا تھا۔ چاروں طرف قیامت کا منظر تھا لیکن

یہ تین سو، چار سو یا شاید پانچ سو سال کا پرانا درخت ایک پُرشور مہیب بحری طوفان میں ساکن جزیرے کی طرح قائم تھا: ایک بے آب و گیاہ ریگستان میں خوشنما لہلہاتے ہوئے نخلستان کی طرح تنہا۔ قدرت نے ایک ہی جھلک میں کائنات کی تصویر کے دونوں پہلو دکھا دیئے۔

میں یونہی سوچتا ہوا اپنے بھیگے ہوئے کوٹ کو نچوڑ رہا تھا کہ اتنے میں کہیں پاس ہی سے بکری کے بچے کی "میں میں" سنائی دی۔ معاً گھوم کر اور درخت کے تنے کے دوسری طرف جا کر دیکھتا ہوں کہ تنے میں ایک بڑی سی کھوہ ہے جس میں بگی خاموش گم صم ایک سونٹے کے سہارے کھڑی ہے اور بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ اس کے پاس ہی قدموں میں بیٹھا ہوا ہے۔

مجھے دیکھ کر بگی ایک دم کانپ اٹھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نمودار ہوئی اور پھر آہستہ سے اس نے اپنا سر نیچا کر لیا۔

میں نے ایک بکری کے بچے کو آہستہ سے گود میں اٹھا لیا۔ سردی میں مجھے اس کی نرم نرم ریشم کے گھنے بال نہایت بھلے معلوم ہوئے۔ یونہی اس بکری کے معصوم بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے میں نے بگی سے پوچھا:

"دو دن سے میں نے تمہیں نہیں دیکھا بگی؟"

وہ خاموش رہی، آنکھیں جھکائے ہوئے۔

میں بکری کے بچے سے کھیلتا رہا۔

اب چاروں طرف خاموشی چھائی تھی، اولے برسنے بند ہو گئے تھے۔

آخر ایک صدیوں کی طرح لمبے عرصے کے بعد میں نے آہستہ سے کہا: "یہاں تو بہت

سردی ہے کیا میں کھوہ کے اندر آ سکتا ہوں؟"
کوئی جواب نہ پا کر میں کھوہ کے اندر آ گیا۔
"اچھی خاصی کھوہ ہے۔" میں نے آپ ہی بلند آواز میں کہنا شروع کیا، "پتا نہیں اس درخت کی عمر کیا ہو گی؟ بگی؟ شاید دو تین سو سال ہو گی۔ کیوں بگی؟ ٹھیک ہے نا؟ کتنی اچھی جگہ ہے۔ طوفان اور برف و باراں میں غریب چرواہے اسی درخت کی کھوہ کا سہارا ڈھونڈتے ہوں گے، ٹھیک ہے نا! بولتیں کیوں نہیں؟"
بگی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ آہ! وہ دلکش ہنسی! اس کے موتیوں کی طرح خوشنما دانت چمک رہے تھے اور اس کا غنچہ سا دہن اس کوہستانی گلاب کے پھول کی طرح روشن ہو گیا جس کے درمیان برف رکھ دی گئی ہو۔
میں نے لکڑیوں کو زمین پر چھوڑتے ہوئے پوچھا: "کیوں ہنس رہی ہو بگی؟"
اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ہنس رہی تھی اور کانپ رہی تھی۔ اس کے بازو ننگے تھے اور اس کی قمیص جابجا پھٹی ہوئی تھی۔
"تمہیں سردی لگ جائے گی بگی، لو یہ کوٹ پہن لو۔"
اُس نے ہنسنا بند کر دیا اور چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ میں اُسے کوٹ پہنانے لگا۔ جب میں کوٹ پہنا چکا تو اس نے آہستہ سے اپنے بازو میری گردن میں ڈال دیے اور اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا اور سسکیاں لے کر رونے لگی۔
میں اس کی ہنسی کو نہ سمجھ سکا تھا لیکن اس کے رونے کو سمجھ گیا۔ محبت کے پُرسوز نغمہ نے یکا یک دل کے ویرانے کو روشن کر دیا۔ میں بگی کے پریشان بالوں سے کھیلنے لگا۔ وہ سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی اور اپنی پریشان لٹوں سے آنسوؤں کو پونچھتی

جاتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی سسکیاں کم ہوتی گئیں۔

اور بے بند ہو چکے تھے اور اب برف باری شروع ہو گئی۔ چاروں طرف دھند اور تاریکی چھا رہی تھی۔ شاید اس اتنی بڑی دنیا میں اب وہی سرول کا گھنا چھتنارا محفوظ ترین جگہ تھا اور اسی چھتنارے کے نیچے کھڑے دو فرد اور دو دھڑکتے ہوئے دل باہر کے طوفان سے پناہ مانگ رہے تھے۔

اور ـــــ اگر اسی کوکھ میں کھڑے کھڑے محبت کے ان دو پتنگوں کی عمریں بیت جاتیں تو کیا ہی اچھا ہوتا!

سرول کا چھتنارا، بھیڑ بکریوں کا ریوڑ، گلی اور میں، اور خوشی کے آنسو یا شاید غم کے آنسو! کون کہہ سکتا ہے فطرت کس قدر پُر اسرار ہے!

ـــــ اور اس کے دو دن بعد وہ مر گئی، نہیں، اس کے وحشی باپ نے اُسے مار ڈالا۔

کیا وہ ایک رات بھر ایک سرول کے درخت کی کوکھ میں ایک اجنبی کے پاس نہ رہی تھی؟ اس نے ٹھیک کیا اسے مار ڈالا۔ یہ جنگل کا قانون تھا۔ اُس نے اس کی لاش کو گھسیٹ کر جھیل کے کنارے برف پر پھینک دیا۔ شاید میری اپنی آنکھوں نے اسے جھیل کے کنارے برف کے سفید بستر پر سوئے دیکھا۔ کتنی گہری نیند تھی، کبھی نہ ختم ہونے والی۔ اس کے بازو کھلے تھے، اس کے سنہری بال اُلجھے ہوئے، چہرہ کنول کے نوزائیدہ پھول کی طرح سپید اور اس کی ڈنڈی کی طرح نازک گردن میں ایک گہرا شگاف تھا۔ یاقوت کی طرح گہرا سرخ۔ میں جانتا ہوں کہ میں اُسے اس طرح پڑے دیکھ کر پاگل ہو گیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ میں نے اس وقت آگے بڑھ کر دو گھٹنے ٹیک

کمرے اس گہرے بانوتی گھاؤ کو چوم لیا تھا۔ آہ، مگر یہ تو ایک بیوقوف مصور کی فطری کمزوری تھی۔ وہ اس ایک بوسے سے اس سونے کی مورت میں روح پھونکنا چاہتا تھا۔

بے سود، محض بے سود۔

تم کتنے ہو کہ میرا خط پڑھ کر کملا پہروں روتی رہی۔ تمہیں پتا ہے فیروز میں ان سات دنوں میں کس قدر رویا ہوں۔ کیا میرے آنسو کملا کے آنسوؤں کی سزا ہیں۔ جانے دو فیروز بھائی، یہ آنسو کس کام کے ہیں، میرے اور کملا کے۔ بے سود، بالکل بے سود۔

پتا نہیں یہ آنسو کب بند ہوں گے، پتا نہیں یہ برف باری کب بند ہو گی۔ بہرصورت میں کل صبح جھیل کے اس پار جاؤں گا جہاں صنوبر کا ایک گھنا جھنڈ ہے جس کے تنے میں ایک بڑی کھوہ ہے۔ جھیل کے کنارے میری کشتی انتظار کر رہی ہو گی اور جھیل کے اس پار میری تیاگ!

یہ کون گا رہا ہے؟ سنتے ہو کتنا میٹھا، پُر درد گیت ہے:

ہن آ، ہن آ، ماہیا گلے نال لا، نال لا، ماہیا

بینوں . . . .

روزنامچہ پولیس تھانہ دھرمسال

۸ ر نومبر

آج ڈاک بنگلے کے چوکیدار مسمی صاحب دین کی رپورٹ پر کالا رام خوانندہ

کنسٹبل کو جھیل پر بھیجا گیا۔ ایک اُلٹی ہوئی کشتی ملی اور پانی میں تیرتی ہوئی ایک لاش
چوکیدار مذکور کا بیان ہے کہ اس نے کل شام متوفی کو آخری مرتبہ دیکھا جب کہ وہ ننگے
سر جھیل کی طرف بھاگتا ہوا جا رہا تھا۔ چوکیدار نے کئی بار آوازیں دیں مگر متوفی نے
کوئی جواب نہ دیا۔ متوفی رات کو واپس بنگلے پر نہیں آیا۔

متوفی کے جسم پر کوئی چوٹ یا خراش نہیں۔ موت غالباً خودکشی سے ہوئی یا اتفاقیہ
ڈوب جانے سے۔ متوفی کا نام شیام سُندر تھا۔ وہ لاہور کا رہنے والا تھا اور یہاں
بغرضِ سیر و سیاحت آیا تھا۔ لاش بغرضِ پوسٹمارٹم سول سرجن صاحب بہادر کو بھیج
دی گئی ہے۔ مزید تفتیش جاری ہے۔

بقلم خود
حق نواز خاں، محرّر،
تھانہ چوکی دھرمسال۔

یرقان

"یرقان بذاتِ خود کوئی بیماری نہیں" یہ بھی ڈاکٹروں کا ایک مفروضہ ہے، سائنسدان کے اس مفروضے کی طرح کہ چاند بذاتِ خود روشن نہیں۔ دراصل اسی قسم کے مفروضوں سے ڈاکٹر اور سائنس دان عامیوں سے الگ پہچانے جا سکتے ہیں ورنہ یہ تو غیر ممکن ہے کہ ہم میں سے کوئی چاند کی ٹھنڈی چاندنی اور یرقان جیسی تکلیف دہ بیماری سے انکار کر سکے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میری بات پر مطلق یقین نہ کیا جائے اور اسے محض ایک یرقانی نظریہ قرار دے کر طاقِ نسیاں پر دھر دیا جائے۔

بہر حال آپ کو باور کر لینا چاہیئے کہ یرقان ایک بیماری ہے اور بہت اذیت پسند۔ بصورتِ دیگر آپ کو اس کہانی کے پڑھنے یا سننے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس کہانی کے شروع ہونے پر میں یرقان میں مبتلا تھا۔ جس طرح ساون کے اندھے کو ہر طرف سبزہ ہی سبزہ دکھائی دیتا ہے اسی طرح یرقان میں

آدمی کو ہر طرف زردی ہی زردی نظر آتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی غیبی ہاتھ نے کل کائنات پر زعفران انڈیل دیا ہو اور بس۔ اس کے بعد مرض کا ایک اور درجہ ہے، زندگی کی ایک منزل ہے جہاں سب دوئی مٹ جاتی ہے اور مجھ ایسا شریف کنوارا نروان حاصل کر لیتا ہے۔

بس یہی بیماری اس مختصر سے قصّے کی ابتدا تھی۔ نہ میں بیمار پڑتا نہ شاما میری عیادت کو آتی۔ شاما کے متعلق میں صاف طور پہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میری محبوبہ ہے، یعنی میں اس سے محبت کرتا ہوں اور وہ اپنے خاوند سے محبت کرتی ہے جو بنگال کی انجینئرنگ کے ایک بھٹے پر ملازم ہے، بیس روپے تنخواہ پاتا ہے اور بھٹے پر کام کرنے والے مزدوروں کی حاضری لگاتا ہے اور کبھی کبھی اپنی حسین بیوی کو خط لکھ دیتا ہے جس میں اکثر سیف الملوک، شاہ بہرام اور حسن بانو کے پاکیزہ اشعار درج ہوتے ہیں۔ شاما وہ خط اکثر مجھ سے پڑھوایا کرتی ہے۔ اس وقت اس کا چہرہ شرم سے لال ہو جاتا ہے۔ بچاری ان پڑھ ہے نا۔ اور جب میں سیف الملوک ملوک الکلام کی تشریح اپنے مخصوص بیرقانی انداز میں کرتا ہوں تو کس قدر گھبرا جاتی ہے، لجاتی ہے اور پیاری معلوم ہوتی ہے۔ گل عارض پر چمک اور آنکھوں میں دمک آجاتی ہے، لب کانپتے ہیں اور پھر مجھے یکا یک اس کی مہین شیریں آواز سنائی دیتی ہے: "آگے کیوں نہیں پڑھتے؟" اور ——— میں بھلا خط پڑھتے پڑھتے اس کے چہرے کی طرف کیوں دیکھنے لگ گیا تھا؟ محبت؟ نہیں یرقانیت! یا اللہ مجھے محبت ہے کہ یرقان؟

ایک دن ——— وہ دن مجھے اچھی طرح یاد ہے ——— میں بستر پر کروٹ کے بل

بیٹھا ہوا ریشم کے کیڑوں سے کھیل رہا تھا۔ ہمارے پڑوسی نے ریشم کے کیڑے پالے تھے، وہ ان کے کوئے بیچا کرتا تھا بڑی اچھی تجارت ہے۔ پچھلے سال اس نے دو ماہ کے قلیل عرصے میں کوئے بیچ کر تین سو روپے کمائے تھے۔ میرا چھوٹا بھائی اس سے آٹھ دس ریشم کے کوئے مانگ لایا تھا۔ ان کویوں میں سے پانچ پھوٹ گئے تھے اور ان میں سے ریشم کے کیڑے نکل آئے تھے۔ سفید اور زردی مائل کیڑے جو کویوں سے نکل کر نہ کچھ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں صرف سات دن زندہ رہتے ہیں۔ اس عرصے میں نر و مادہ آپس میں جنسی تعلقات قائم کرتے ہیں، اس کے بعد نر مر جاتا ہے۔ پھر مادہ انڈے دیتی ہے: زرد، باریک، اور گول گول خشخاش کے دانوں جیسے: اس کے بعد مادہ بھی مر جاتی ہے۔ بس یہی سات دن ان کی حیاتِ معاشقہ ہیں۔

میں ان ریشم کے کیڑوں سے کھیل رہا تھا۔ ان میں چار نر تھے اور ایک مادہ۔ بڑے بڑے زرد دیدہ دل والی، جو خاموش بیٹھی نر کیڑوں کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے تک رہی تھی۔ وہ کسے پسند کرے گی؟ کس پر اس کی نظرِ انتخاب پڑے گی؟ وہ کون خوش نصیب ہوگا جو اس سیمیں تن حسینہ کا محبوب ہوگا؟ آپ سمجھ لیجئے مقابلہ واقعی سخت تھا۔ نر کیڑے دیوانہ وار بھونروں کی طرح اس کی طرف اڑ اڑ کر چلے جاتے تھے؛ وہ پروانوں کی طرح شمع کے گرد طواف کرتے تھے؛ کبھی وہ آپس میں گتھ جاتے، اس طرح کہ مجھے ان میں سے کسی ایک کی ہلاکت کا شبہ ہو جاتا، پھر میں جلدی سے انہیں الگ الگ کر دیتا۔ وہ کچھ دیر چپ بیٹھے رہتے، بالکل خاموش، بے حس و حرکت مگر جلد ہی وہ حسین مجسمہ انہیں اپنی طرف مائل کر لیتا اور پھر بے اختیار، پھڑ پھڑانے لگتے کبھی ایک کبھی دوسرا اڑ کر مادہ کے پاس جاتا اور اپنے منہ کو اس کے منہ

کے قریب لا کر نہایت چرب زبانی سے اپنے عشق کا اظہار کرتا۔ وہ کافر ادا کبھی مسکراتی، کبھی بے اعتنائی سے منہ موڑ کر پرے ہو جاتی، تو بچارا اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا۔ عورت کی فطرت میں دو رُخی کیوں ہے؟ ایک ہی نظر سے یہ گھاؤ بھی پیدا کرتی ہے اور اس پر پھاہا بھی رکھ دیتی ہے؛ دل تڑپا دیتی ہے اور تسکین بھی پہنچاتی ہے! ستم بھی اس کو پھبتا ہے کرم بھی اس کے شایاں ہے۔

یہی سوچتے سوچتے میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ کسی کے پاؤں کی ہلکی سی چاپ، سنائی دی اور کوئی میرے سرہانے آکر کھڑا ہوا۔

میں نے آنکھیں کھولے بغیر ہی کہا: "ماں، دلیہ لائی ہو؟"

"نہیں، میں ہوں شاما"

اگر میرے پیٹ پر رکھی ہوئی پانی کی بوتل یک لخت پھٹ جاتی تو بھی مجھے اس قدر تعجب نہ ہوتا جس قدر شاما کے آنے پر ہوا۔ جب سے میں بیمار ہوا تھا، اور مجھے بیمار پڑے تین ماہ ہو چکے تھے، وہ ایک دفعہ بھول کر بھی مجھے پوچھنے نہ آئی تھی۔ کیا اس کے خاوند کا چکوال سے کوئی خط نہ آیا تھا؟

"شاما، تم؟" میں نے خالص ڈرامائی انداز میں کہا۔

"ہاں میں!" اس نے خالص دیہاتی انداز میں جواب دیا۔ "یہ لو۔ تمہارے لیے چند ایک خوبانیاں لائی ہوں۔ خوب پکی ہیں اور میٹھی۔" یہ کہہ کر اس نے رومال کھول کر سب خوبانیاں میرے بستر پر بکھیر دیں۔

یرقان میں مجھے دو چیزیں بہت مرغوب و موافق ہیں: ایک خوبانی دوسری شاما۔ اور پھر جب دونوں اکٹھی مل جائیں تو میری خوش قسمتی کے کیا کہنے! آج میں

واقعی خوش قسمت تھا۔ میں آہستہ سے اُٹھ کر بیٹھ گیا اور اخبار کا وہ صفحہ جس پر ریشم کے کیڑے دھرے تھے، آہستہ سے پرے رکھ کر کہا: "آؤ بیٹھو۔"

وہ پائنتی پر بیٹھ کر بولی: "کیا حال ہے؟"

"اچھا ہے۔"

کچھ دیر ہم دونوں "صم بکم" بیٹھے رہے۔ میں نہ جانتا تھا کہ مجھے کیا کہنا چاہیئے۔ دل میں جذبات کا طوفان اُمڈ آیا تھا۔ اپنے غم اور غصے کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا مگر یکایک زبان گنگ ہو گئی؛ دل میں شکایتوں کا طومار تھا مگر لب جیسے کسی نے سی دیئے تھے؛ دل میں بے چینی کا طوفان تھا مگر آنکھیں اس کے چہرے کو دیکھ کر مسرور ہو گئیں۔ آخر سوچ سوچ کر میں نے کہا: "چکوال سے کوئی خط آیا؟"

"نہیں تو۔ تم تو بہت ہی نحیف ہو گئے ہو۔ تمہاری آنکھیں اس قدر زرد کیوں ہیں؟ مجھے از حد افسوس ہے میں اس سے پہلے تمہارے ہاں نہ آ سکی، ماں کی طبیعت علیل تھی۔ خوبانی کیوں نہیں کھاتے؟ کھاؤ!"

میں نے مشکور نگاہوں سے اسے دیکھا، ایک خوبانی اٹھائی اور منہ میں ڈال کر دل کو لعنت ملامت کرنے لگا: ارے میاں کچھ تو کہو۔ اگر شکایت کی جرأت نہیں تو اظہارِ محبت ہی سہی۔ ان تعریفی نگاہوں سے کیا ہوتا ہے، کھل کر بات کرنا سیکھو گونگے عاشق کو تو ادھیڑ عمر کی عورتیں بھی پسند نہیں کرتیں۔

"شاما، تم . . ." میں نے کہنا شروع کیا۔

"اچھا، یہ ریشم کے کیڑے ہیں!" شاما نے جلدی سے اخبار کو اپنی طرف سرکا کر کہا، "کس قدر خوبصورت ہیں۔ تم نے کہاں سے پائے؟ اچھا یہ مادہ ہے، یہ نر ہیں۔ کیا

خوب۔ اور اب اس نر مادہ کا آپس میں ایجاب قبول ہو گیا۔ دیکھو تو یہ کیڑا بڑا انسان ہے، پتا نہیں اس سے کیا کیا میٹھی میٹھی باتیں کہتا ہے۔ سبھی مرد ایسے ہوتے ہیں۔ ہے نا! یہ جوڑا تو الگ ہوا۔

"اب یہ باقی تین کہاں جائیں گے بچارے! کس طرح سسک رہے ہیں، دیکھو" میں نے شاما کی طرف دیکھا، سونے کی مورت معلوم ہوتی تھی۔ لب تھوڑے سے کھلے تھے اور طلائے احمر کی طرح دمک رہے تھے۔

"تم کس قدر خوبصورت ہو شاما" میں نے سینمائی انداز میں کہا "اس سے بھی زیادہ خوبصورت جتنا کہ تم اپنے آپ کو سمجھتی ہو۔ میری آنکھوں اور تمہارے حسن کے درمیان ایک زرد پردہ حائل ہے مگر پھر بھی تم مجھے بہت حسین نظر آتی ہو، اور اگر یہ پردہ سامنے سے ہٹ جائے تو پھر کیا یہ تابناک حسن میری آنکھوں کو خیرہ نہ کر دے گا! اور تمہاری آنکھیں کس قدر روشن ہیں، صاف اور پاکیزہ، نیلوفر کی طرح کھلی ہوئیں۔"

ماں دلیہ لے کر اندر آئیں، کہنے لگیں "بیٹا نیلوفر کی بابت کیا کہہ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں اماں۔ یہی . . . یہی . . . کہ . . . سنا ہے کہ نیلوفر یرقان میں بہت مفید ہے۔"

"ہاں میں ابھی ابھی ان سے یہ ذکر کر رہی تھی۔" شاما نے سر جھکا کر کہا "پتا نہیں انہیں موافق آئے نہ آئے۔"

"نہیں بیٹی، مجھے دیسی دوائیوں پر یقین نہیں اور بعض حکیم تو . . ." اماں شاما سے باتیں کرنے لگیں، میں چپ چاپ دلیہ کھانے لگا۔

شاما بہت حسین تھی اس لیے چاہنے والے بھی بہت تھے۔ وہ بیاہی ہوئی تھی اور یہاں میکے آئی ہوئی تھی۔ عاشقوں کے وافر ہونے کی یہ بھی ایک وجہ تھی۔ اس کا باپ مرچکا تھا اور اس کی والدہ اس رنڈاپے میں بھی سہاگ کی شان اور جوانی کی آب کو قائم رکھے ہوئے تھی۔ اس امر نے بھی شاما کے عاشقوں کی تعداد میں معتدبہ اضافہ کر دیا تھا اور ان تمام امور کا شاما کو بخوبی احساس تھا۔ اس کے شریف اور باعصمت ہونے کی یہ بھی ایک وجہ تھی۔

ہمارا قصبہ بہت چھوٹا ہے، اتنا کہ اس میں صرف پانچ حکیم، تین ڈاکٹر اور دو وید پریکٹس کرتے ہیں۔ سوڈا واٹر کی صرف ایک دکان ہے۔ ملائی کی برف بیچنے والا بھی ایک سے زیادہ نہیں ہے اور وہ ایک نوجوان ہے منچلا اور شاما کا چاہنے والا۔ شاما کی ماں اس سے ہر روز پاؤ آدھ پاؤ ملائی کی برف مفت کھا جاتی ہے۔ صرف دو درزی ہیں: ایک بچارہ ہے سیدھا سادھا آدمی، وہ قمیص کی سلائی دو آنے تک خوشی سے قبول کر لیتا ہے، دوسرا راولپنڈی پاس ہے۔ اس نے تین سال تک راولپنڈی میں ایک مشہور و معروف انگریزی "ٹیلرنگ شاپ" میں کام سیکھا ہے۔ وہ سلائی صرف اتنی طلب کرتا ہے جتنی کپڑے کی قیمت ہو۔ ہمارے قصبے کے نوجوان اس سے بڑے شوق سے کپڑے سلواتے ہیں۔

ہمارے قصبے میں ایک مڈل سکول ہے۔ پہلے پرائمری تک ہی تعلیم دی جاتی تھی، مڈل کلاسیں اس سال کھلی ہیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نو وارد ہیں۔ خوبصورت، خوش پوش، نوجوان ہیں۔ سکول کو اپنے کالج کا بدل بنانا چاہتے ہیں۔ گاتے خوب ہیں۔ ڈور سے بڑے اچھے!

معلوم ہوتا ہے گویا کوئی گراموفون بج رہا ہے۔ پیارہ و قوّال کا "من تو شدم تو من شدی" انہیں بہت مرغوب ہے۔ شاما کے گھر سے گزرتے ہوئے انہیں اکثر گنگناتے بلکہ صاف گاتے ہوئے سنا گیا ہے۔ شاما بھی کبھی دریچے میں بیٹھ کر سن لیتی ہے۔ اس کے چہرے پر اس وقت ایک عجیب مسکراہٹ ہوتی ہے۔ جوشِ رقابت میں میں اُسے محبت سے تعبیر کرتا ہوں۔

ہمارا قصبہ نائب تحصیلدار صاحب کا صدر مقام ہے۔ وہ مجسٹریٹ بھی ہیں اور طبیب بھی۔ ان کی غیر معمولی ہر دلعزیزی کا بڑا بھاری سبب یہی ہے۔ فارسی اچھی خاصی جانتے ہیں اور ادیب بھی ہیں۔ شاما کو خالص فنی نقطۂ نگاہ سے دیکھنے اور پرکھنے کے عادی ہیں اور اس پر اس انداز سے تنقید کرتے ہیں گویا شاما نہیں، زندہ عورت نہیں بلکہ لئے گیو کا ایک مرمریں مجسمہ ہے یا باطلی سیلی کی پُرکیف تصویر۔

ہمارے قصبے میں باوا تہمن گر کا استھان بہت مشہور ہے۔ عقیدت مند، جن میں جو اکثر طبقۂ اناث سے تعلق رکھتی ہے، انہیں صرف "باواجی" کہہ کر پکارتی ہیں۔ باواجی کی جوانی ڈھل چکی ہے مگر ہر بات میں جوانوں سے آگے قدم دھرتے ہیں۔ "فنا ہونے سے پہلے کھیلتی ہے موج پانی پر" چرس کا دم لگاتے ہیں، شراب پیتے ہیں اور شاما سے افلاطونی محبت رکھتے ہیں۔ قد لانبا، جسم اکہرا اور رنگ بگلے کی طرح سپید ہے۔

ساون!

ساون برسات کا مہینہ ہے، ساون میں جھولے پڑتے ہیں، شاعر اور ندی نالے طغیانی پر آجاتے ہیں، دل میں اُمنگیں اٹھتی ہیں، شاید خون کچا ہوتا ہے، جوش مارتا

ہے۔ میں نے بھی اپنی کوٹھڑی چھوڑ دی اور باہر باغ میں آ رہا۔ سرول کے ایک گھنے چھتنارے کے نیچے میرا بستر تھا اور اس کے نزدیک ہی ایک چنار پر میری چھوٹی بہن نے جھولا ڈلوایا تھا۔ قصبے بھر کی لڑکیاں، دوشیزائیں اور نویلی بہوئیں ہمارے ہاں جھولا جھولنے آتی تھیں۔ بڑا دلکش منظر ہوتا تھا۔ جب شاما پینگ بڑھاتی تو میرا دل بلیوں اچھلنے لگتا اور جب وہ پینگ بڑھاتے بڑھاتے دور اوپر چنار کی ٹہنیوں کے سبز سبز پتوں میں ایک لمحے کے لیے گم ہو جاتی تو میرا دل اچک کر گلے میں آ رہتا۔ کہیں وہ گر نہ پڑے!

ایک دن، جب شاما جھولا جھول رہی تھی اور میرا نوکر رالی میرے پاؤں داب رہا تھا، میں نے اس سے پوچھا: "رالی، اگر وہ گر پڑے تو پھر کیا ہو؟"

رالی بولا: "کون بابو جی؟"

"شاما"

رالی بچارا حیران نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اسے میری بات سمجھ میں نہ آئی۔ اسے کیا پتا تھا کہ محبت کیا چیز ہوتی ہے۔

رالی بچارا سیدھا سادا نوکر ہے۔ کبھی کبھی ہکلا کر بات کرتا ہے۔ باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیم ہے کیونکہ اس کی سوتیلی ماں نے اسے گھر سے نکال دیا ہے اور بڑے بھائی کے پیار اور ماں باپ کے لاڈ اور چاؤ نے عالم شباب ہی میں اس کے بال کھچڑی کر دیے ہیں۔

"رالی!" میں نے اسے ایک لمبے وقفے کے بعد کہا، "تم میری بات نہیں سمجھے۔"

اتنے میں شاما کی ماں دوڑتی ہوئی آئی، کہنے لگی: "بابو جی، ذرا رالی کو اجازت دینا،

پن چکی سے آٹا پسا کر لے آئے، بڑی مہربانی ہوگی۔(آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر)
آج ضرور بارش ہوگی، اور اگر رالی ابھی ابھی آٹا نہ لے آیا تو پھر ندی زوروں پر ہو جائے
گی۔ دیکھیے بادل پہاڑوں پر کیسے چھائے ہوئے ہیں۔"

رالی بولا: "میں ابھی جاتا ہوں۔"

میں نے کہا: "میری طرف سے اجازت ہے۔" رالی یہ سنتے ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔

رالی بیچارا بہت سیدھا سادا ہے۔ میں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی، چاروں طرف بادل چھا رہے تھے اور مشرق کی طرف تو کالا دھاری کی چوٹیاں کالی گھٹاؤں میں چھپی ہوئی تھیں۔ میں نے دل میں سوچا آج ندی میں خوب طغیانی آئے گی۔ پہاڑی نالہ مرد آدمی کے غصے کی طرح ہے، جلد چڑھتا ہے اور جلد ہی اتر جاتا ہے۔ ساون کے دنوں میں ندی کئی جانیں لے لیتی ہے۔ نالہ ایک دم ٹھاٹھیں مارتا ہوا آتا ہے اور کناروں سے اچھل کر میلوں اطراف میں پھیل جاتا ہے۔ گاؤں کے گاؤں تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ ڈھور ڈنگر اور اناج اور مال کے نقصان کا کچھ اندازہ نہیں۔

اماں میرے نزدیک آ کر کہنے لگیں: "اندر چلو آج بارش ہوگی، گھٹا تلی کھڑی ہے۔ رالی کہاں ہے؟"

شاما کی ماں نے پن چکی سے آٹا لانے کو کہا تھا، اِدھر ہی گیا ہوگا۔ چلو اندر چلتا ہوں۔"

تھوڑی دیر کے جھوٹا جھولتے جھولتے بارش شروع ہو گئی۔ پل میں جل تھل ہو گیا۔ ندی کی پُر شور آواز میری خوابگاہ کے اندر بھی سنائی دے رہی تھی۔

رات کے دس بج گئے، رالی نہ آیا۔ اماں اسی فکر میں کھوئی ہوئی میرے پاس بیٹھی رہیں۔ "کمبخت کو اس وقت جانے کی کیا ضرورت تھی، انکار کر دیتا۔" اماں نے کہا۔

"میں نے ہی اجازت دے دی تھی۔" میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

"تم بھی نادان ہو۔ وہ بھلا اس موسلا دھار بارش میں کیسے آئے گا؟ ذرا ندی کا شور تو سنو! ٹھاٹھیں مار رہی ہے۔ اور وہ اس وقت تک کیوں نہیں آیا؟ پن چکی بھی تو دور نہیں ہے، یہی چار میل کے قریب ہو گی۔ اسے اس وقت تک آجانا چاہیے تھا کہیں اس پار ہی نہ رہ گیا ہو۔"

"اور اماں" میں نے جھجکتے ہوئے کہا، "اگر اس نے ندی کو عبور کرنے کی کوشش کی ہو — یوں تو اچھا خاصا تیراک . . ."

"چپ بٹیا، یوں نہیں کہا کرتے۔ رام سب کا بھلا کرتے ہیں۔"

بارہ بج گئے مگر مجھے نیند نہ آئی۔ شمع کی تھرتھراتی ہوئی لو میں میں نے دیکھا کہ اماں وہیں بیٹھے بیٹھے سو گئی ہیں۔ اتنے میں آنگن میں آہٹ سی ہوئی، کسی نے دیوار کے ساتھ اپنا سونٹا ٹیک دیا اور لمبی سانس لی۔

میں نے کہا: "رالی ہے۔"

"جی ہاں۔"

"آٹا لے آئے۔"

"دے آیا بابو جی۔ وہاں، ان کے گھر تو سب سوئے پڑے تھے، ددھوا کو جگایا اور اس کے حوالے کر کے ابھی آرہا ہوں۔"

"کمبخت میں پوچھتا ہوں تم آٹا کیسے لے آئے؟"

"کمال میں بابو جی۔ بالکل نہیں بھیگنے دیا۔ ندی بڑے زوروں پر تھی، پرمیشر نے ہی جان سلامت رکھی۔"

"بیوقوف تمہیں آنے کی اتنی کیا جلدی تھی؟ ندی کے پار ہی رہ جاتے۔"

"میں نے سوچا شاما بھوکی رہے گی۔"

جواب سن کر میں بھونچکا رہ گیا۔ یہ بینگن کے پودے میں انگور کے خوشے کیسے؟ تلخ لہجے میں میں نے اس سے پوچھا: "اور اگر تم ندی میں غرق ہو جاتے تو؟"

رالی تھوڑی دیر چپ رہا، پھر ہکلانے لگا "میرا . . . رالی کیا ہے بابوجی، یہ زندگی ک . . . ک . . . کسی کے کام آجاتی، میں اپنے آپ کو بھاگوان سمجھتا۔"

"کمبخت، مجنوں بھی کوئی تمہاری ہی طرح کا گنوار ہوگا۔"

"کیا کہا بابوجی۔"

"کچھ نہیں، جاؤ، سو رہو۔"

اب شمع زرد پڑ چکی تھی — زرد اور بالکل ساکن۔ صرف ایک پروانہ اس کے گرد گھوم رہا تھا۔ میں غنودگی سے لبریز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا: پروانہ . . . . شمع . . . . رالی . . . . پروانہ . . . . رالی . . . . شمع . . . . رالی . . . شاما . . . . شمع . . . .

باوا اتھمن گر کا "استھان" ندی کے کنارے شمشان بھومی کے قریب واقع ہے۔ اس میں ایک چھوٹا سا مندر ہے اور ایک مختصر سا باغیچہ اور اس کے ساتھ کپڑے دھونے کا گھاٹ۔ باواجی اور ان کا چیلا سومناتھ وہیں دیوی کے قدموں میں آسن جمائے ہیں اور رات کو بھی وہیں پڑ کر سو رہتے ہیں۔ ندی میں ہر سال طغیانی آتی ہے مگر مندر ہمیشہ محفوظ و مامون رہتا ہے۔ پچھلے سال تو گھاٹ بھی بہ گیا تھا مگر مندر جوں کا توں کھڑا

رہا۔ یہ سب باواجی کی دُعا کا اثر ہے۔ انسان کے فوق الفطرت ہونے کا ثبوت۔ شاما کی ماں دودھوا باواجی کو ہر روز پرنام کرنے جاتی ہے اور شاما بھی کبھی کبھار اس کے ساتھ جایا کرتی ہے۔ میں نے پہلے پہل اُسے باواجی کے باغیچے میں ہی دیکھا تھا۔ اس نے جوہی کے پھولوں کا ایک گچھا اپنے بالوں میں لگا رکھا تھا اور دوپٹے میں پھول چن چن کر رکھ رہی تھی۔ آہ! جوہی کے پھول۔

کتنی مدت ہو گئی اس اولیں ملاقات کو مگر آج پھر وہ پہلی نگاہیں اور جوہی کے پھول مجھے رہ رہ کر یاد آ رہے تھے۔ ہم گھڑی کی سوئیوں کو اُلٹ پلٹ کر سکتے ہیں مگر زمانے کی سوئی کو اُلٹا پھیر دینے کی کس میں ہمت ہے؟ کاش وہ پہلی نگاہیں مجھے واپس مل جائیں، کاش میں انہیں پھر اک بار دیکھ لیتا۔ وہ نگاہیں جنہوں نے میرے سینے میں امنگوں کا طوفان برپا کر دیا تھا، جنہوں نے محبت کی سوئی ہوئی ندی کو اپنے نازک تھپیڑوں سے متلاطم کر دیا تھا۔ مگر آج وہ حقیقت محض ایک خواب ہے، شفق کی طرح رنگین، قوس قزح کی طرح دُور۔

رالی میرے پاؤں داب رہا تھا۔ میں نے اُسے آہستہ سے کہا: "رالی مندر سے جوہی کے پھول لاؤ گے؟"

رالی بولا: "بابوجی بارش ہو رہی ہے۔" پھر یہ کہہ کر خود ہی اُٹھ کھڑا ہوا، "اچھا جاتا ہوں۔"

رالی اُسی موسلا دھار بارش میں اُٹھ کر چلا گیا۔ آج اس کی نگاہ اولیں کی یاد نے دل کی دبی ہوئی امنگوں میں ایک ہیجانی کیفیت سی پیدا کر دی تھی۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنی خیالی دنیا میں گم ہو گیا۔ اس دنیا کو مجھ سے کوئی چھین نہیں سکتا۔ اس خیال سے مجھے ایک گونہ تسلی ہوتی ہے کہ یہ دنیا میری ہے اور اس جسدِ خاکی کے

آخری سانس، زندگی کے آخری لمحے اور دل کی آخری دھڑکن تک یہ دنیا میری ہو گی۔
شاید اب یہ دنیا ہی میرا سرمایۂ حیات ہے۔ اس دنیا میں پہنچ کر مجھے احساس ہوتا ہے
کہ میں ایک ناؤ بن گیا ہوں ۔۔ ایک ناؤ جو چاروں طرف لہروں سے گھری ہوئی ہے۔
لہریں کھیلتی ہیں، مسکراتی ہیں، ڈوبتے ہوئے سورج کی ارغوانی کرنوں کو چمک چمک کر
پیار کرتی ہیں۔ یکایک میں نے اپنے بادبان پھیلا دیتا ہوں اور لہریں اپنے شانوں پر لیے
ہوئے مجھے دُور دُور بہالے جاتی ہیں۔ پتا نہیں کس طرف؟ نہ جانے کیوں؟ مجھے
صرف اک خاموش موسیقی اور اک جانفزا سرور کا احساس ہوتا ہے۔ کیف آور اور شیریں۔

پتا نہیں میں کتنا عرصہ اسی خیالی دنیا میں گم رہا یا کتنا عرصہ اور اسی خیالی دنیا میں گم رہتا اگر اماں میرا شانہ جھنجھوڑ کر جگا نہ دیتیں، "بیٹا، اُٹھو تو سہی، وہ دیکھو رالی . . ."

میں نے آہستہ سے کہا: "کیا بات ہے ماں۔ رالی پھُول لے آیا؟"

"اچھا تو کیا تم نے اُسے مندر بھیج دیا تھا؟" اماں نے کہا، "آہ بچارا رالی! اس کا بازو ٹوٹ گیا ہے اور اس کے سر پر کئی چوٹیں آئی ہیں۔ برآمدے میں پڑا ہے۔"

میں جلدی سے اُٹھ کر برآمدے میں گیا۔ رالی آنکھیں بند کئے چارپائی پر پڑا آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ سر پر اور دائیں بازو پر پٹیاں بندھی تھیں۔ میں نے پوچھا "بیوقوف، کیا مندر میں باوا جی لڑ پڑے۔ اگر وہ پھول نہ دیتے تھے تو واپس چلے آتے، جھگڑا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ سومناتھ نے بھی پٹیا ہو گا تمہیں۔ جیسا گورو ویسا چیلا۔"

"وہ مندر کہاں رہا بٹیا! یہ جو تین دن سے لگاتار بارش ہو رہی تھی اس کمبخت جھڑی کو کچھ نے کر ہی ٹلنا تھا۔ آج ندی میں اس قدر طغیانی ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ خدا شور تو شنو۔ اور جب رالی مندر کی طرف پھول لینے گیا تو مندر کے چاروں طرف پانی چڑھ

رہا تھا اور گھاٹ بہہ رہا تھا۔"

"تو — میں نے تو اُسے یوں ہی بھیج دیا تھا، اگر پانی چڑھ رہا تھا تو نہ جاتا، ایسی بھی . . ." میں نے فقرہ نا تمام چھوڑ دیا۔

"کیسے نہ جاتا بیٹا، وہاں شاما . . ."

"کیا کہا، شاما؟"

اماں میری بات ان سُنی کر کے بولیں: "اور دیکھو یہ باوا اور اس کا چیلا — دونوں کتنے کمینے نکلے۔ ان کو اتنا بھی نہ خیال آیا کہ . . ."

"مگر شاما کیا؟" میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

"کہہ تو رہی ہوں بیٹا" اماں جلدی سے بولیں "کہ شاما بھی وہاں گئی ہوئی تھی اور دیوی جی کی پوجا تمام کر کے باغیچے میں جوہی کے پھول چن رہی تھی کہ بارش نے آگھیرا۔ وہیں مندر میں ٹھہر گئی۔ سوچا ہوگا کہ بارش تھمے تو جاؤں۔ آن کی آن میں جل تھل ہو گیا۔ مندر کے چاروں طرف پانی لہریں مارنے لگا اور جب نیا گھاٹ بھی بہنے لگا اور ندی کا رخ مندر کی طرف مڑا تو باوا جی بڑے گھبرائے، چیلے سمیت بھاگ کھڑے ہوئے۔"

"اور شاما کو وہیں چھوڑ دیا؟" میں نے جلدی سے پوچھا

"کچھ نہ پوچھو۔ جان تو سب کو پیاری ہوتی ہے۔ جب رالی وہاں پہنچا تو پانی نے مندر کو چاروں طرف اچھی طرح سے گھیر لیا تھا، شاما سیڑھیوں پہ کھڑی چیخیں مار رہی تھی اور باوا جی اور ان کا چیلا تیرتے ہوئے خشکی کی طرف آ رہے تھے۔"

"کمینے!" میں نے تیز تر لہجے میں کہا

اتنے میں کسی نے باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا، اماں اندر چلی گئیں۔ نائب تحصیلدار

صاحب تھے۔ برآمدے میں آکر رالی کے سرہانے بیٹھ گئے، کہنے لگے: "آپ کے نوکر نے آج جوانمردی دکھائی۔ مندر کی گرتی ہوئی دیواروں اور ٹھاٹھیں مارتے ہوئے پانی کے ریلوں سے شاما کو بچا کر لے آیا۔ چوٹیں تو بہت لگی ہیں بچارے کو۔ میں نے ڈاکٹر سے وہیں پٹی وغیرہ کا انتظام کر دیا تھا۔ آج شام کو ڈاکٹر پھر آئے گا۔ رالی بیٹا تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے۔"

اتنا کہہ کر تحصیلدار صاحب چپ ہو گئے اور رالی کی طرف دیکھنے لگے۔ رالی خاموش لیٹا ہوا تھا، میں نے اس کی نبض دیکھی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"کیوں روتے ہو رالی؟" میں نے پوچھا۔

رالی نے دھیمے لہجے میں جواب دیا: "بابوجی سر میں بہت درد ہے۔"

تحصیلدار صاحب چارپائی سے اٹھ کر بولے: "اچھا تو میں چلتا ہوں اور ڈاکٹر کو ابھی آپ کے ہاں بھیجتا ہوں۔ چوٹیں تو معمولی ہیں، میرے خیال میں ایک دو دن میں اچھا ہو جائے گا، فکر نہ کریں۔ شاما کا خاوند، سنا ہے، کل یہاں پہنچے گا۔"

وہ چلے گئے۔ میں چپ چاپ رالی کے پاس بیٹھا رہا۔ "شاما کا خاوند کل یہاں پہنچے گا . . . کل . . . فکر نہ کریں . . . چوٹیں معمولی ہیں . . . چوٹ . . . کاش تحصیلدار صاحب کو پتا ہوتا کہ یہ چوٹیں معمولی نہیں ہوا کرتیں . . ."

اماں رالی کے لیے گرم دودھ لے آئیں۔ میں چمچے سے اُسے پلانے لگا۔ اماں کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔

اس واقعے کے پانچ روز بعد شاما اپنے خاوند کے ہمراہ چکوال چلی گئی۔
جانے سے قبل وُہ مجھے ملنے کے لیے آئی۔
"میں آج جا رہی ہوں بھیّا۔"
اس کا چہرہ زرد تھا اور لب انار کی کلی کی طرح سُرخ تھے۔
میں نے خاموش نگاہوں سے اُسے دیکھا اور چپ ہو رہا۔ ماں نے ہاتھ پھیلا کر اُسے دعا دی: "پرمیشر تمہارا سہاگ ہمیشہ قائم رکھے۔"
"رالی کدھر ہے بھیّا، میں اُسے ملے بغیر نہ جاؤں گی۔"
ماں نے جواب دیا: "رالی چشمے سے پانی بھرنے گیا ہے، اب آتا ہی ہوگا۔"
گھنٹہ پون گھنٹہ گزر گیا مگر رالی نہ آیا۔
میں نے نہایت نرم لہجے میں آہستہ سے کہا: "شاید وہ نہ آئے گا شاما!
جیسے اس نے میری بات سمجھ لی ہو، وہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی، آہستہ سے بولی: "تم اچھے ہو جاؤ گے بھیّا۔" پھر اس نے سر جھکا کر ماں کو پرنام کیا۔
اور وہ چلی گئی: چپ چاپ، خاموش، سر جھکائے ہوئے، مجرم کی طرح۔
کائنات کا ہر ذرّہ بے مصرف ہے اور انسان کی ہر کوشش بے سود۔ یہ انسان کتنا حقیر ہے، اور یہ دنیا اس سے بھی حقیر تر۔ یہ عقدۂ لاینحل کیا ہے؟ اور کس لیے؟ اور پھر اگر تمام زندگی کو یوں مٹھی میں بند کر کے چُور کر دیا جائے، اس طرح کہ اس کے ریزے ریزے ہو کر بکھر جائیں اور کوئی ان کی ہَوا تک بھی نہ پا سکے، تو پھر . . . تو پھر کیا ہو . . . کس لیے؟ . . . کیونکر؟

دل میں ہزاروں خیال تھے۔

بے سود، سب بے سود۔

بہت دیر کے بعد رالی آیا، پانی کا گھڑا سر پر اُٹھائے ہوئے۔ اس کا چہرا اُترا ہُوا تھا اور ہونٹ نیلے۔ تھوڑی دیر ٹھہر کر جب وہ میرے پاؤں دابنے بیٹھا تو میں نے اس سے پوچھا: "رالی آج کہاں غائب رہا۔"

"ہاں مجھے دیر ہو گئی، بابو جی، معاف کر دو۔" اس نے جواب میں کہا۔

کچھ دیر ہم دونوں خاموش رہے، پھر رالی بولا: "اس دن آپ نے جوہی کے پھول مانگے تھے، آپ یہ گچھا لے سکتے ہیں۔" یہ کہہ کر اُس نے جیب سے پھولوں کا ایک گچھا نکالا اور میرے ہاتھ میں دے دیا۔ باسی پھُول تھے اور پتیاں زرد مگر ان میں خوشبو تھی۔

مجھے تحصیلدار صاحب کی بات یاد آگئی، مَیں نے کہا: "رالی، اسے تم رکھ لو یہ لو اسے تمہیں اپنے پاس رکھو۔"

"نہیں بابو جی میں اسے نہیں لے سکتا۔"

"کیوں؟"

رالی چپ رہا۔

میں نے ایک پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے کہا: "رالی مجھے معلوم نہ تھا کہ تم اتنے جذباتی اور شاعر مزاج ہو۔"

رالی چپ بیٹھا رہا؛ بے جان، بے حس و حرکت، مٹی کی مورت۔ پھر سر جھکا کر کملائے ہوئے

سے میرے پاؤں دابنے لگا۔ گرم آنسوؤں کے ایک دو قطرے میرے پاؤں پر گر پڑے۔
زندگی کس قدر عجیب ہے!
شاما . . . ودھوا . . . باواجی . . . رالی . . . سومنا تھ
. . . . ریشم کے کیڑے . . .
زندگی کس قدر عجیب ہے!

نیا ادارہ

کے خوبصورت مجموعے

نیشنل بک سنٹر آف پاکستان

کی طرف سے

انعام یافتہ

* * * * * *

آبِ رواں	١٩٦٢	ظفر اقبال	١٥/-
اداس نسلیں	١٩٦٣	عبداللہ حسین	٦٠/-
(١٩٦٣) کی بہترین کتاب ، آدم جی انعام یافتہ			
معیار	١٩٦٣	ممتاز شیریں	٢٠/-
دیوانِ غالب	١٩٦٥	اسد اللہ غالب	٦٠/-
نارسا	١٩٦٦	ضیا جالندھری	١٥/-
اندھیر نگری	١٩٦٧	شاد عارفی	١٥/-

معیاری اور خوبصورت کتابوں کا مرکز

نیا ادارہ

سویرا آرٹ پریس

---

١٥ - سرکلر روڈ ، لاہور